اس شمارے میں

اس شمارے میں	شاہد رضا	۳
قرآنیات		
سورۃ التوبہ (۱۰)	جاوید احمد غامدی	۶
مقامات		
مذہبی انتہا پسندی	جاوید احمد غامدی	۱۷
مقالات		
حج و عمرہ	جاوید احمد غامدی	۲۰
سیر و سوانح		
حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا	محمد وسیم اختر مفتی	۲۸
تبصرۂ کتب		
”نسائیات“	پروفیسر خورشید عالم	۳۹

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شاہد رضا

اس شمارے میں

''قرآنیات'' میں حسب سابق جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ سورۂ توبہ (۹) کی آیات ۱۱۳-۱۲۹ کے ترجمہ اور حواشی پر مشتمل ہے۔ خاتمۂ سورہ کی ان آیات میں خطاب مسلمانوں سے ہے اور ان کو ہدایت فرمائی ہے کہ وہ مشرکین کے لیے اللہ تعالیٰ سے استغفار نہ کریں، اسی حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے جو استغفار کیا، اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو قبولیت توبہ کی بشارت اور کفار سے جنگ، پھر اہل مدینہ اور اعراب کے تائبین کو صادقین کے ساتھ وابستگی کی تاکید فرمائی ہے۔ آخر میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عظیم نعمت ورحمت قرار دیا ہے۔

''مقامات'' میں ''مذہبی انتہا پسندی'' کے عنوان سے جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا شذرہ شامل کیا گیا ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ مذہبی انتہا پسندی ہے اور یہ اسی مذہبی فکر کا مولود فساد ہے جو نفاذ شریعت اور جہاد وقتال کے زیر عنوان اور کفر، شرک اور ارتداد کے استیصال کے لیے ہمارے مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے۔ اس کے خاتمے کے لیے انھوں نے چند تجاویز دی ہیں کہ اولاً، اہل علم اور ارباب حل وعقد اسے علم واستدلال سے واضح کریں۔ ثانیاً، جس طرح دیگر اداروں میں اختصاصی تعلیم کے لیے بارہ سالہ عمومی تعلیم لازمی ہے، اسی طرح دینی مدارس میں بھی داخلے کے لیے بارہ سالہ عمومی تعلیم ضروری قرار دی جائے۔ ثالثاً، مساجد کا انتظام حکومت کے تحت ہو اور ان میں امامت وخطابت کے فرائض حکمران یا ان کے عمال کریں۔

''مقالات'' میں حج کی مناسبت سے جناب جاوید احمد غامدی صاحب کا مضمون ''حج وعمرہ'' شامل اشاعت ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ حج وعمرہ کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے لیے جان ومال کے ذریعے سے کامل اطاعت کے ساتھ حاضر ہو جائے۔ نیز حج وعمرہ کے ایام، طریقہ اور ان کے احکام کی وضاحت کی ہے۔

''سیر وسوانح'' میں جناب محمد وسیم اختر مفتی صاحب کا مضمون ''حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا'' شائع کیا گیا ہے۔ اس میں بیان کیا ہے کہ وہ السابقون الاولون میں سے تھیں۔ نیز ان کے متعدد فضائل، واقعۂ ہجرت، بعض جنگوں میں کردار اور ان کی روایت حدیث کو بیان کیا ہے۔

''نقطۂ نظر'' میں ڈاکٹر محمد شکیل اوج کی کتاب ''نسائیات'' پر پروفیسر خورشید عالم صاحب کا تبصرہ و تعارف شامل اشاعت ہے۔ اس میں تبصرہ نگار نے متعدد مقالات، مثلاً نکاح و طلاق میں زوجین کے حقوق کا تعین، کم سنی کی شادی، پسند کی شادی، تعدد ازدواج، مسیار میرج، زوج اور سوت، محصنین اہل کتاب سے مسلم عورتوں کا نکاح، تفویض طلاق، لونڈیوں سے تمتع یا نکاح، نصاب میں شہادت اور عورتوں کی گواہی، کھلے چہرے کے ساتھ عورتوں کا گھر سے باہر کا پردہ اور نیل پالش کے ساتھ وضو جیسے موضوعات پر مصنف کے نقطۂ نظر پر تبصرہ و تنقیدات پیش کی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ التوبہ

(۱۰)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ یَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ وَلَوۡ کَانُوۡۤا اُولِیۡ
قُرۡبٰی مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُمۡ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ ﴿۱۱۳﴾ وَمَا کَانَ اسۡتِغۡفَارُ
اِبۡرٰہِیۡمَ لِاَبِیۡہِ اِلَّا عَنۡ مَّوۡعِدَۃٍ وَّعَدَہَاۤ اِیَّاہُ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَہٗۤ اَنَّہٗ عَدُوٌّ لِّلّٰہِ تَبَرَّاَ مِنۡہُ

نبی[285] اور اُس کے ماننے والوں کے لیے زیبا نہیں کہ (جن) مشرکین (سے اعلان براءت ہو چکا ہے، اُن) کے لیے مغفرت کی دعا کریں، اگرچہ وہ اُن کے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، جبکہ اُن پر کھل چکا کہ وہ دوزخ کے لوگ ہیں[286]۔ ابراہیم نے تو اپنے باپ کے لیے صرف اُس وعدے کے سبب سے مغفرت

۲۸۵؎ یہ چھٹا اور آخری شذرہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر تبوک سے واپسی کے بعد مدینۂ طیبہ میں کسی وقت نازل ہوا ہے۔

۲۸۶؎ یہ اُس مرحلے کا حکم ہے، جب پیغمبر کی طرف سے اتمام حجت اور اعلان براءت کے بعد بھی لوگ ایمان لانے سے انکار کر دیں۔ پیغمبر اور اُس کے ساتھیوں کی دعائیں قوم کے لیے خدا کی امان ہوتی ہیں۔ جزا و سزا کے اِس مرحلے میں ضروری تھا کہ اُنھیں اِس امان سے محروم کر دیا جائے اور جو عذاب اُن کے لیے مقدر ہو چکا ہے، وہ اُس کو

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَاَوَّاهٌ حَلِيۡمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِلَّ قَوۡمًا ۢ بَعۡدَ اِذۡ هَدٰٮهُمۡ حَتّٰى يُبَيِّنَ لَهُمۡ مَّا يَتَّقُوۡنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۱۱۵﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ

مانگی تھی جو اُس نے اپنے باپ سے کرلیا تھا۔[۲۸۷] مگر جب اُس پر واضح ہو گیا کہ وہ خدا کا دشمن ہے تو وہ اُس سے بے تعلق ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم بڑا نرم دل اور بردبار تھا۔[۲۸۸] (تم یاد رکھو کہ) اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ کسی قوم کو ہدایت دینے کے بعد پھر گمراہی میں مبتلا کر دے، جب تک کہ اُنھیں صاف صاف وہ چیزیں نہ بتا دے جن سے اُنھیں بچنا ہے۔[۲۸۹] اِس میں شبہ نہیں کہ اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ پھر یہ دعائیں حمیت حق کے بھی منافی تھیں، اِس لیے کہ اِس وضاحت کے بعد کہ وہ جہنم کے مستحق ہو چکے ہیں، اگر کسی رشتہ و تعلق کی بنا پر مغفرت کی دعا کی جائے تو اِس کے صاف معنی یہی ہوں گے کہ قرابت کی حمیت حمیت حق پر غالب ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، البتہ اِس طرح کے اتمام حجت اور اعلان براءت کا موقع باقی نہیں رہا۔ چنانچہ کوئی حرج نہیں کہ کفر و شرک کے کسی مرتکب کے لیے بھی اُن الفاظ میں دعا کر دی جائے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے اختیار فرمائے ہیں کہ اِنۡ تُعَذِّبۡهُمۡ فَاِنَّهُمۡ عِبَادُكَ، وَاِنۡ تَغۡفِرۡ لَهُمۡ، فَاِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ*، (آپ اُنھیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں اور اگر معاف کر دیں تو آپ زبردست ہیں، بڑی حکمت والے ہیں)۔

۲۸۷؎ اِس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وعدے کی اہمیت کس قدر غیر معمولی ہے۔

۲۸۸؎ یہ باپ کے معاملے میں ابراہیم علیہ السلام کی دردمندی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پسندیدگی کا اظہار ہے۔ تاہم جب واضح ہو گیا کہ باپ فی الواقع خدا کا دشمن ہے تو اُنھوں نے سختی کے ساتھ اعلان براءت بھی کر دیا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ”... چونکہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اُس کی محبت میں موم بھی بنے اور پتھر بھی، اِس وجہ سے حضرت ابراہیم نے اپنے دل کے یہ دونوں پہلو نمایاں کیے اور یہی صحیح نمونہ ہے دین کے خدمت گزاروں کے لیے۔ جب تک اُن کے سینے میں دردمند دل نہ ہو، خلق کی ہدایت کے لیے اُن کا اٹھنا بے سود اور جب تک عزم میں لوہے کی صلابت اور پہاڑ کی استقامت نہ ہو، دین کے لیے اُن کا وجود بالکل ناکارہ!“ (تدبر قرآن ۳/ ۶۵۵)

* المائدہ ۵: ۱۱۸۔

وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۱۶﴾
لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ
الْعُسْرَةِ مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ
رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا حَتّٰٓى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا

اللہ ہی ہے کہ زمین وآسمان پر جس کی بادشاہی ہے۔ وہی زندگی دیتا اور وہی مارتا ہے اور اللہ کے سوا نہ تمھارا کوئی حامی ہے اور نہ مددگار۔۱۱۳-۱۱۶

اللہ نے نبی پر اور (نبی کے ساتھی) اُن مہاجرین وانصار پر رحمت کی نظر کی جنھوں نے تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، اِس کے بعد کہ اُن میں سے بعض کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ پھر اللہ نے اُن پر رحمت کی نظر کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اُن پر مہربان ہے، بڑا رحم فرمانے والا ہے۔[۲۹۰] (اِسی طرح)

۲۸۹؎ یہ مسلمانوں کو تنبیہ فرمائی ہے کہ خدا نے تمھیں راہ ہدایت دکھانے کے بعد اُن خطرات سے بھی آگاہ کر دیا ہے جو اِس راہ کے مسافر کو پیش آسکتے ہیں۔ رشتہ وقرابت کی بنا پر اُن لوگوں کے لیے دعائیں جن کے بارے میں خدا نے اعلان کر دیا ہو کہ وہ اُس کے دشمن ہیں، تمھارے ایمان کے لیے فتنہ بن سکتی تھیں۔ چنانچہ صاف صاف بتا دیا ہے کہ یہ تمھارے لیے زیبا نہیں ہے۔ آگے صفات الٰہی کے حوالے سے یاددہانی ہے۔ یہ اِسی تنبیہ کا جزو ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غایت درجہ احتیاط کرو۔ تمھارا معاملہ اُس ہستی کے ساتھ ہے جو زمین وآسمان کا بادشاہ ہے، موت وحیات کا مالک ہے، ظاہر وباطن، ہر چیز کا جاننے والا ہے، اُس سے متعلق کسی نفاق کا شائبہ بھی دل ودماغ میں رہنے دو گے تو اندیشہ ہے کہ کسی بڑے خطرے سے دوچار ہو جاؤ گے۔ پھر اُس کے سوا کوئی حامی اور مددگار نہ پاسکو گے۔

۲۹۰؎ آیت میں فعل 'تَابَ' کا صلہ 'عَلٰی' کے ساتھ آیا ہے اور اُس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ یہ اِس طرح آئے تو رحمت وعنایت کے مضمون پر متضمن ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اُس طرح کی کوئی غلطی صادر نہیں ہوئی تھی، جس طرح کی غلطیوں پر پیچھے لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے۔ آپ کا معاملہ صرف یہ تھا کہ اپنی کریم النفسی کے باعث آپ نے بعض موقعوں پر منافقین سے چشم پوشی فرمائی تھی، دراں حالیکہ اُس وقت یہ چشم پوشی تطہیر کی اُس مہم کے خلاف تھی جو عذاب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے پیش نظر تھی۔ اِس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔ اِسی طرح مہاجرین وانصار کا

رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْٓا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّآ اِلَيْهِ ثُمَّ تَابَ
عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾

اُن تینوں پر رحمت کی نظر کی جن کا معاملہ اٹھا رکھا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین اپنی وسعت کے باوجود اُن پر تنگ ہوگئی اور وہ خود اپنی جانوں سے تنگ آ گئے اور اُنھوں نے اندازہ کرلیا کہ خدا سے خدا کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہیں ہے[۲۹۱]، پھر اللہ نے اپنی رحمت سے توجہ فرمائی کہ وہ (اُس کی طرف) پلٹیں[۲۹۲]۔ یقیناً اللہ ہی ہے جو توبہ قبول کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔۱۱۷-۱۱۸

سواد اعظم اگرچہ ہر قسم کے شدائد و مصائب کے باوجود ثابت قدمی کے ساتھ راہ حق پر قائم رہا، مگر ایک چھوٹے سے گروہ سے تبوک کے موقع پر کچھ کمزوری صادر ہوئی۔ یہ اُسی کا حوالہ ہے کہ اُن میں سے بعض کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے۔ تاہم یہ لوگ بھی جلد بیدار ہو گئے اور توبہ و استغفار سے اپنے دلوں کو راہ حق پر استوار کر لیا۔ اِس آیت نے سب کو بشارت دے دی کہ اللہ کی رحمت اُن کی طرف متوجہ ہے۔ وہ تبوک کے موقع پر اور اِس سے پہلے بھی تنگی کے ہر وقت میں پیغمبر کے ساتھ رہے ہیں۔ اللہ نے اِسی بنا پر اُن کی ہر کوتاہی معاف کر دی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''... اِن الفاظ کا حوالہ ایک تو اِس حقیقت کو واضح کر رہا ہے کہ اصل ایمان اُن کا ایمان ہے جو مصائب و شدائد کی کسوٹیوں پر جانچے اور پرکھے جا چکے ہوں۔ دوسری بات اِس سے یہ نکلی کہ دراصل مہاجرین و انصار کے ایمان کی یہی خصوصیت ہے جو اُن کے لیے سفارش بنی کہ اللہ تعالیٰ اُن پر اپنی رحمت کی نظر اور اُن کی توبہ قبول فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اپنے وفادار و جاں نثار بندوں کو توفیق خیر سے محروم نہیں فرماتا۔ جب اُن سے کوئی کمزوری صادر ہو جاتی ہے، اُن کے دل میں وہ توبہ کی بے قراری پیدا کرتا ہے، پھر وہ توبہ کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اُن کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر انداز صرف اُن کو کرتا ہے جو صرف زبان سے عشق کا دعویٰ کرتے ہیں، اِس راہ میں چوٹ کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۶۵۷)

۲۹۱۔ اِن کا ذکر پیچھے آیت ۱۰۶ میں ہو چکا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تینوں پورے پچاس دن زیر عتاب رہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر مسلمانوں کی پوری جماعت نے اِن کا مقاطعہ کر دیا۔ اللہ کے پیغمبر نے بھی رخ پھیر لیا۔ اعزہ و اقربا، دوست احباب، یہاں تک کہ بیوی بچے بھی بالکل غیر بن کر رہ گئے*۔ اِسی کو بیان کیا ہے کہ زمین اپنی وسعت

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/ ۵۱۹۔

کے باوجود اُن پر تنگ ہوگئی۔ اِس کا اثر اِن کے باطن پر یہ پڑا کہ خدا اور رسول کی ناراضی کے احساس نے اِنھیں خود اپنے وجود سے بے زار کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نہ باہر سکون کی کوئی جگہ نظر آتی تھی اور نہ اپنے دل کے اندر سکون و اطمینان کا کوئی گوشہ تلاش کر سکتے تھے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِن کے دل پگھل اٹھے اور یہ توبہ و انابت کے اُس معیار تک پہنچ گئے جو اِس مرتبے کے لوگوں سے مطلوب تھا۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...جتنی ہی شدت کے ساتھ اِن لوگوں پر عتاب ہوا، اتنی ہی بے قراری کے ساتھ اِن لوگوں نے اپنے آپ کو خدا کے آگے ڈال دیا کہ جب گرفت خدا کی طرف سے ہے تو اِس سے پناہ صرف وہی دے سکتا ہے۔ چنانچہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ تین میں سے دو صاحبوں نے تو بالکل ہی خانہ نشینی اختیار کر لی، رات دن گریہ وزاری اور توبہ واستغفار کے سوا اِن کا کوئی کام ہی نہیں رہ گیا۔ تیسرے صاحب اگرچہ کسی کسی وقت باہر نکلتے، لیکن صرف اِس امید میں کہ شاید کسی گوشے سے خدا اور رسول کی رضا کی کوئی مہک آجائے۔* اگر اِن کے اندر نفاق کا کوئی جرثومہ ہوتا تو جب یہ خدا اور رسول کی طرف سے پھینکے گئے تھے، کسی اور کی پناہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتے۔ لیکن یہ راسخ الایمان لوگ تھے، اِس وجہ سے ٹھیک اُس بچے کی طرح جو ماں کی جھڑکی سے سہم کر خود ماں ہی سے چمٹتا ہے، یہ خدا کے عذاب سے بچنے کے لیے خدا ہی کی طرف بھاگے۔'' (تدبر قرآن ۳/۶۵۹)

۲۹۲ اصل الفاظ ہیں: 'ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا'۔ 'لِيَتُوْبُوْا' میں فعل کامل اور حقیقی معنی میں ہے۔ اپنے گناہ کا اعتراف تو یہ پہلے ہی کر چکے تھے، لیکن آزمایش کے اِن سخت مراحل سے گزرنے کے بعد اِن کے دل اچھی طرح گداز ہو گئے تو اللہ نے رحمت کی نظر فرمائی اور اِنھیں اُس توبہ کی توفیق بخشی جس نے دل و دماغ کو ہر آلودگی سے پاک کر دیا۔ قرآن کے اِن الفاظ سے ایک اور حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''...توبہ کی ابتدا اصلاً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ وہی پہلے بندے کے دل میں رجوع الی اللہ کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ پھر جب بندہ توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوبارہ اُس پر رحمت کی نظر فرماتا اور اُس کی توبہ قبول کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ اگر اُس کے اندر ایمان ہو تو ہر گناہ پر اُس کا دل کڑھتا اور آزردہ ہوتا ہے اور ایک احساس ندامت کے ساتھ اُس کے اندر اپنے رب کی طرف رجوع ہونے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ اگر آدمی اپنے اِس جذبے کے مطابق عمل کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے دل اور زبان پر وہ الفاظ اور کلمات بھی جاری فرما دیتا ہے جو اُس کو پسند ہیں اور جن کو وہ شرف قبولیت بخشتا ہے۔ اِس سے محروم صرف وہ بدقسمت لوگ

* تفسیر القرآن العظیم، ابن کثیر ۲/۵۲۰۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۹﴾ مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِیْنَةِ
وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ وَلَا یَرْغَبُوْا بِاَنْفُسِهِمْ
عَنْ نَّفْسِهٖ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ لَا یُصِیْبُهُمْ ظَمَاٌ وَّلَا نَصَبٌ وَّلَا مَخْمَصَةٌ فِیْ سَبِیْلِ
اللّٰهِ وَلَا یَطَـُٔوْنَ مَوْطِئًا یَّغِیْظُ الْكُفَّارَ وَلَا یَنَالُوْنَ مِنْ عَدُوٍّ نَّیْلًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ
بِهٖ عَمَلٌ صَالِحٌ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَلَا یُنْفِقُوْنَ نَفَقَةً صَغِیْرَةً

ایمان والو، (اِن غلطیوں سے بچنا چاہتے ہو تو) اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔[۲۹۳] (حقیقت یہ ہے کہ) مدینہ والوں اور اُن کے گردونواح کے بدویوں کے لیے زیبا نہ تھا کہ وہ اللہ کے رسول کو چھوڑ کر پیچھے بیٹھے رہیں اور نہ یہ زیبا تھا کہ اپنی جان کو اُس کی جان سے عزیز رکھیں۔ یہ اِس لیے کہ جو پیاس، تکان اور بھوک بھی اُن کو خدا کی راہ میں لاحق ہوتی ہے اور (پیغمبر کے) منکروں کو رنج پہنچانے والا جو قدم بھی وہ اٹھاتے ہیں اور (اُس کے) کسی دشمن کو جو چرکا بھی لگاتے ہیں، اُن سب کے بدلے میں ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے۔ اللہ خوبی اختیار کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔[۲۹۴] (اِسی

رہتے ہیں جن کا ضمیر کند اور جن کا ایمان مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ ایسے لوگ خدا سے بے پروا ہو جایا کرتے ہیں جس کی سزا اُن کو یہ ملتی ہے کہ خدا بھی اُن سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ آدم و ابلیس کی سرگذشت، جو سورۂ بقرہ میں بیان ہوئی ہے، وہ اِس کی نہایت حقیقت افروز مثال ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۶۶۰)

۲۹۳ اصل میں لفظ 'صٰدِقِیْنَ' استعمال ہوا ہے۔ یہ منافقین کا ضد ہے، یعنی وہ لوگ جن کے قول و فعل میں پوری مطابقت ہو۔ پیچھے جن کوتاہیوں پر گرفت ہوئی ہے، اُن سے بچنے کے لیے یہاں خدا سے ڈرنے اور سچے لوگوں کی معیت اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ پہلی چیز اندر سے انسان کی حفاظت کرتی ہے اور دوسری باہر سے اُس کو شیطان کے مقابل میں مدد پہنچاتی ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...اگر آدمی کا رہنا سہنا، اٹھنا بیٹھنا کافروں، منافقوں اور جاہلوں کے ساتھ ہو تو کمزور تو درکنار بسا اوقات مضبوط آدمی بھی کچھ نہ کچھ اُن کا اثر قبول کر ہی لیتا ہے۔ اِسی طرح راسخ الایمان اور راسخ العمل لوگوں کے فیض صحبت سے کمزور آدمی کے اندر بھی اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کا حوصلہ پیدا ہو جایا کرتا ہے اور وہ بالتدریج اُن کے زمرے کا

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

وَّلَا كَبِيْرَةً وَّلَا يَقْطَعُوْنَ وَادِيًا اِلَّا كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوْا كَآفَّةً فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ
طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

طرح) جو چھوٹا یا بڑا انفاق وہ کرتے ہیں اور (راہ حق میں) جو وادی بھی قطع کرتے ہیں، سب اُن کے لیے لکھا جاتا ہے تاکہ اللہ اُن کے عمل کا اچھے سے اچھا بدلہ دے۔ یہ تو ممکن نہیں تھا کہ مسلمان، سب کے سب نکل کھڑے ہوتے، مگر ایسا کیوں نہ ہوا کہ اُن کے ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلتے تا کہ دین میں بصیرت پیدا کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو (اُن کے اِن رویوں پر) خبردار کرتے، جب اُن کی طرف لوٹتے، اِس لیے کہ وہ بچتے[۲۹۵]۔ ۱۱۹-۱۲۲

آدمی بن جاتا ہے۔'' (تدبر قرآن ۳/۶۶۰)

۲۹۴؎ اصل میں لفظ 'مُحْسِنِيْنَ' آیا ہے۔ یہ اُس شرط کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اللہ کے ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے ضروری ہے۔ یعنی جب کوئی عمل کیا جائے تو اُس کی روح اور قالب، دونوں پورے توازن کے ساتھ پیش نظر ہوں، اُس کا ہر جزو بہ تمام وکمال ملحوظ رہے اور اُس کے دوران میں آدمی اپنے آپ کو خدا کے حضور میں سمجھے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ کا معاملہ اپنی راہ میں دکھ اٹھانے اور مصیبتیں جھیلنے والوں سے یہ ہے تو اُن کے لیے بھی زیبا نہیں کہ وہ اپنے جان و مال کو پیغمبر کے مقابل میں ترجیح دیں۔

۲۹۵؎ یہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لیے تجویز فرمایا ہے جو دور دراز کے علاقوں میں رہنے کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات بھی آپ سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے تھے۔ بالبداہت واضح ہے کہ یہی اہتمام آپ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ہونا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوا ہے کہ سب مسلمانوں کے لیے تو یہ ممکن نہیں ہے، لیکن اُن کی ہر جماعت میں سے کچھ لوگوں کو لازماً اِس مقصد کے لیے نکلنا چاہیے کہ وہ دین کا علم حاصل کریں اور اپنی قوم کے لیے نذیر بن کر اُسے آخرت کے عذاب اور خدا کی گرفت سے بچانے کی کوشش کریں۔ یہ اگر غور کیجیے تو بعینہٖ وہی کام ہے جو اللہ کے نبی اور رسول اپنی قوم میں کرتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دعوت و انذار کا کام آپ کے بعد اِس امت کے علما کو منتقل ہوا ہے اور ختم نبوت کے بعد یہ ذمہ داری اب قیامت تک اُنھیں ہی ادا کرنی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ
اَيُّكُمْ زَادَتْهُ هٰذِهٖٓ اِيْمَانًا فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

ایمان والو، (اِن تنبیہات کے بعد اب نکلو اور جس طرح کہ پیچھے حکم دیا گیا ہے)، اپنے گردوپیش کے منکروں سے جنگ کرو[۲۹۶] اور چاہیے کہ وہ تمھارے اندر سختی پائیں،[۲۹۷] تم جان لو کہ اللہ اُن کے ساتھ ہے جو تقویٰ اختیار کرنے والے ہوں۔[۲۹۸] (اِن پر افسوس، یہ کہاں نکلیں گے؟ اِن کا حال تو یہ ہے کہ) جب کوئی سورت اترتی ہے تو اِن میں سے بعض وہ بھی ہیں جو پوچھتے ہیں کہ اِس نے تم میں سے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے؟[۲۹۹] سو حقیقت یہ ہے کہ جو فی الواقع ایمان لائے ہیں،[۳۰۰] اُن کے ایمان میں تو اُس نے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۲۹۶؎ آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے، لیکن روے سخن اُنھی منافقین کی طرف ہے جو اپنی دوستیوں، رشتہ داریوں اور کاروباری تعلقات کے پیش نظر اُن لوگوں کے خلاف کسی اقدام کے لیے تیار نہیں تھے جن کے ساتھ اِس سورہ میں جنگ کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر شخص کو اُنھی سے لڑنا ہے جو اُس کے گردوپیش میں رہتے ہیں اور کسی نہ کسی لحاظ سے اُس کے اپنے ہیں۔ ایمان و اخلاص کا اصلی امتحان اِسی سے ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ گوسالہ پرستی کے جرم کی پاداش میں جب بنی اسرائیل کے قتل عام کا حکم دیا گیا تھا تو اُس میں بھی یہی تقاضا کیا گیا تھا۔ آیت میں 'يَلُوْنَكُمْ' کی قید اِسی پہلو کو نمایاں کر رہی ہے۔

۲۹۷؎ یعنی محسوس کر لیں کہ تمھارے اندر اب اُن کے لیے دوستی، موالات اور محبت کی کوئی جگہ باقی نہیں رہ گئی ہے۔ جزا و سزا کے مرحلے میں یہی تقاضا ہے جس کے پیش نظر ترک موالات کا حکم دیا جاتا ہے۔ اِس کا اُن لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو ابھی مرحلۂ دعوت کے مخاطبین ہوں۔

۲۹۸؎ یہ فتح و نصرت کی بشارت ہے اور ہمیشہ اِسی شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ لوگ تقویٰ پر قائم رہیں اور جنگ و جدال کے موقع پر بھی خدا کے مقرر کردہ حدود سے کوئی تجاوز نہ کریں۔

۲۹۹؎ یہ تعریض کا جملہ ہے۔ اِس سے اُن کا مقصود خدا کے احکام کی تحقیر اور اُن لوگوں کی حوصلہ شکنی تھا جو پورے اخلاص کے ساتھ اُن احکام کو سننے اور اُس پر عمل کے لیے آمادہ رہتے تھے۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ
كٰفِرُوْنَ ﴿۱۲۵﴾ اَوَلَا يَرَوْنَ اَنَّهُمْ يُفْتَنُوْنَ فِيْ كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً اَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوْبُوْنَ
وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذَا مَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ نَّظَرَ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ هَلْ
يَرٰىكُمْ مِّنْ اَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوْا صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿۱۲۷﴾

اضافہ کر دیا اور وہ اُس سے بشارت حاصل کر رہے ہیں۔ رہے وہ جن کے دلوں میں (نفاق کا) روگ ہے تو اُن کی نجاست پر اُس نے ایک اور نجاست بڑھا دی اور وہ مرنے تک منکر ہی رہے۔[301] کیا وہ نہیں دیکھتے کہ سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ وہ آزمایش میں ڈالے جاتے ہیں،[302] پھر بھی نہ توبہ کرتے ہیں، نہ یاددہانی حاصل کرتے ہیں[303] اور (کسی نئی مہم کی تیاری کے لیے) جب کوئی سورت اتاری جاتی ہے تو ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کوئی دیکھتا تو نہیں، پھر نکل بھاگتے ہیں۔ اللہ نے اِن کے دل (اپنے قانون

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

۳۰۰؎ اصل الفاظ ہیں: 'فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'۔ اِن میں فعل اپنے کامل اور حقیقی معنی میں ہے۔ ہم نے ترجمہ اُسی کے لحاظ سے کیا ہے۔

۳۰۱؎ یہ محض استعارہ نہیں، بلکہ ایک حقیقت ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

> ''...قرآن کا ہر حکم اہل ایمان کے لیے ایک میدان مسابقت کھولتا ہے اور جب وہ اِس میدان کی بازی جیت لیتے ہیں تو اُن کی قوت ایمانی میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ درجہ بدرجہ وہ سعادت کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ برعکس اِس کے اہل نفاق ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی اور ایک پسپائی کے بعد دوسری پسپائی کی ذلتیں سہتے سہتے عزم و ایمان کی آخری رمق سے بھی بالکل خالی ہو جاتے ہیں اور اُن کے دلوں پر نفاق کی اتنی موٹی تہیں جم جاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کے اندر جتنی صلاحیتیں ودیعت فرمائی ہیں، سب اُن کے نیچے دب دبا کر مردہ ہو جاتی ہیں۔'' (تدبر قرآن ۳/ ۲۶۵)

۳۰۲؎ یہ معاملہ ابتلا کے اُسی قانون کا حصہ ہے جو رسولوں کے براہ راست مخاطبین سے متعلق قرآن میں بیان ہوا ہے۔ اِس طرح کی آزمایشیں عام لوگوں کی زندگی میں بھی اُن کی تذکیر و تنبیہ کے لیے وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہیں، تاہم ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر شخص کو اور ہر سال پیش آئیں۔

لَقَدۡ جَآءَكُمۡ رَسُوۡلٌ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ عَزِيۡزٌ عَلَيۡهِ مَا عَنِتُّمۡ حَرِيۡصٌ عَلَيۡكُمۡ
بِالۡمُؤۡمِنِيۡنَ رَءُوۡفٌ رَّحِيۡمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ حَسۡبِىَ اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيۡهِ
تَوَكَّلۡتُ وَهُوَ رَبُّ الۡعَرۡشِ الۡعَظِيۡمِ ﴿۱۲۹﴾

کے مطابق) پھیر دیے ہیں، اِس لیے کہ یہ سمجھنے والے لوگ ہی نہیں ہیں[۳۰۴]۔ ۱۲۳-۱۲۷

(لوگو)، تمھارے پاس خود تم میں سے ایک رسول آیا ہے[۳۰۵]۔ تمھارا نقصان میں پڑنا اُس پر بہت شاق ہے۔ وہ تمھاری بھلائی کا حریص ہے، ایمان والوں کے لیے سراپا شفقت اور سراسر رحمت ہے[۳۰۶] ـــــ پھر بھی یہ روگردانی کرتے ہیں تو (اے پیغمبر)، کہہ دو کہ میرے لیے اللہ کافی ہے[۳۰۷]۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ میں نے اُس پر بھروسا کیا اور وہ عرش عظیم کا مالک ہے۔ ۱۲۸-۱۲۹

۳۰۳؎ یعنی نہ عقل بیدار ہوتی ہے کہ تذکر حاصل کریں اور نہ دل پگھلتے ہیں کہ خدا کی طرف متوجہ ہو جائیں۔

۳۰۴؎ یعنی اپنے اُس قانون کے مطابق جو اُس نے لوگوں کی ہدایت وضلالت کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔

۳۰۵؎ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے اللہ تعالیٰ نے تمام خلق پر عموماً اور اہل عرب پر خصوصاً جو احسان عظیم فرمایا، یہ اُس کی طرف توجہ دلائی ہے۔ روے سخن اُنھی شامت زدہ لوگوں کی طرف ہے جو اِس نعمت عظمیٰ کی قدر کرنے کے بجاے اِسے اپنے لیے ایک مصیبت سمجھ رہے تھے۔

۳۰۶؎ یہ تمام صفات حرف عطف کے بغیر آئی ہیں۔ اِس سے مقصود یہ ہے کہ اِن میں کامل اتصال کا اظہار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ جس ہستی کی ناقدری کر رہے ہو، اُس کا حال تو یہ ہے کہ جس طرح ایک باپ اپنی اولاد کو ہر تکلیف، ہر پریشانی، ہر دکھ اور ہر کرب سے محفوظ رکھنے کے لیے بے تاب ہوتا ہے، وہ تمھارے لیے اُسی طرح بے تاب ہے، تمھیں دنیا کی ہر سعادت سے بہرہ مند دیکھنا چاہتا ہے اور ایمان پر قائم ہو جاؤ تو تمھارے لیے سراپا رأفت ورحمت ہے۔ اِن آخری دو صفات کے بارے میں استاذ امام امین احسن اصلاحی نے لکھا ہے:

”...ایک کے اندر دفع شر کا پہلو نمایاں ہے، دوسرے کے اندر عطاے خیر اور پائداری رحمت کا۔ یہ دونوں صفتیں اللہ تعالیٰ کی صفات حسنیٰ میں سے ہیں جو بعینہٖ یہاں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے استعمال ہوئی ہیں، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ خلق کے ساتھ رأفت ورحمت کے معاملے میں رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم بالکل صفات الٰہی کے مظہر

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تھے۔“ (تدبر قرآن ۳/ ۶۶۷)

۳۰۷؎ یعنی تمھاری یہ بات اگر اِن کی سمجھ میں نہیں آ رہی کہ خدا کی راہ میں اور اُس کے حکم پر جس جہاد و قتال کے لیے تم اِنھیں بلا رہے ہو، اُس میں خود اِن کے لیے دنیا اور آخرت کی کیا کیا سعادتیں پوشیدہ ہیں تو پروا نہ کرو اور اِنھیں صاف صاف بتا دو کہ یہ میری کوئی ضرورت نہیں ہے، میرے لیے میرا پروردگار ہی کافی ہے۔

کوالالمپور

۲۳/ جولائی ۲۰۱۱ء

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

مذہبی انتہا پسندی

یہ بات اب محتاج دلیل نہیں رہی کہ ریاست پاکستان کے لیے اِس وقت سب سے بڑا مسئلہ مذہبی انتہا پسندی ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ فکر و خیال اور زبان و قلم سے آگے اب یہ قتل و غارت اور دہشت گردی کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ سیاست، معیشت، معاشرت، ہر چیز اِس کی زد میں ہے اور ہزاروں بچے، بوڑھے اور جوان اِس کی نذر ہو چکے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اِس طرح کی صورت حال میں بالآخر لڑنے ہی کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے اور ہماری ریاست کو بھی غالباً ایک دن یہی کرنا پڑے گا۔ پھر توبہ و استغفار بھی کرنی ہوگی کہ آیندہ ہم مذہب کو اپنے سیاسی مقاصد کے لیے کبھی استعمال نہیں کریں گے۔ اِس کی نوبت اگر آ جائے تو انتہا پسندی کو اُس کی جڑ بنیاد سے اکھاڑنے کے لیے یہ چند باتیں مزید پیش نظر رہنی چاہییں:

ایک یہ کہ انتہا پسندی کا یہ عفریت براہ راست آسمان سے نازل نہیں ہوا۔ یہ اُسی مذہبی فکر کا مولود فساد ہے جو نفاذ شریعت اور جہاد و قتال کے زیر عنوان اور کفر، شرک اور ارتداد کے استیصال کے لیے ہمارے مدرسوں میں پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہے۔ انتہا پسند افراد اور تنظیمیں اُسی سے الہام حاصل کرتی ہیں اور کچھ ترمیمات کے بعد اپنے پیش نظر مقاصد کے لیے اُس کو عمل کے سانچے میں ڈھال لیتی ہیں۔ یہ مذہبی فکر قرآن و حدیث کی جن تعبیرات پر مبنی ہے، اُن کی غلطی دور حاضر میں اسلام کے جلیل القدر مفکرین واضح کر چکے ہیں۔ علم و استدلال کے مقابلے میں ہنگامہ و احتجاج اور زور و قوت کے اظہار کا طریقہ ختم ہو جائے تو اِن مفکرین کے رشحات فکر ذہنوں کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ رائج مذہبی فکر کے مقابلے میں یہ گویا ایک جوابی بیانیہ (counter narrative) ہوگا۔ لیکن پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ اُس میں دین و شریعت کی حفاظت کا یہی طریقہ رائج ہے۔ تہذیب اور شایستگی کے ساتھ اختلاف رائے کی روایت بدقسمتی سے یہاں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قائم نہیں ہوسکی۔ یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہمارے اہل دانش اور ارباب حل وعقد مذہبی افکار کے آزادانہ اظہار کے لیے بھی اُسی طرح حساس ہوں، جس طرح وہ سیاسی افکار کے معاملے میں حساس ہیں اور اِس آزادانہ اظہار کو روکنے کے لیے جو لوگ دباؤ ڈالنے کی کوشش کریں، اُنھیں صاف صاف بتا دیں کہ یہ دباؤ ناقابل قبول ہے۔ وہ اگر اپنے ساتھ اختلاف رکھنے والوں کی غلطی واضح کرنا چاہتے ہیں تو اُن کے لیے بھی واحد راستہ یہی ہے کہ اُسے علم واستدلال سے واضح کرنے کی کوشش کریں۔ علم کی دنیا میں ہنگامہ واحتجاج اور جبر واستبداد کے لیے کوئی گنجایش نہیں ہے۔ پھر یہ اہل دانش اور ارباب حل وعقد خود بھی اُس بیانیہ کو سمجھنے کی کوشش کریں جس کا ذکر اوپر ہوا ہے۔ مسلمانوں کے معاشرے میں سیکولرازم کی تبلیغ نہیں، بلکہ مذہبی فکر کا ایک جوابی بیانیہ ہی صورت حال کی اصلاح کرسکتا ہے۔ علامہ اقبال نے ''تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ'' کے زیرعنوان اپنے خطبات میں اِسی حقیقت کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تھی۔

دوسری یہ کہ ہم کسی شخص کو یہ اجازت تو نہیں دیتے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر ہی وہ بچوں کو ڈاکٹر، انجینئر یا کسی دوسرے شعبے کا ماہر بنانے کے ادارے قائم کرے، مگر دین کا عالم بننے کے لیے اِس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اِس مقصد کے لیے طلبہ ابتدا ہی سے ایسے مدرسوں میں داخل کر لیے جاتے ہیں، جہاں اُن کے مستقبل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ قدرت نے، ہوسکتا ہے کہ اُنھیں ڈاکٹر، انجینئر، سائنس دان یا شاعر وادیب اور مصور بننے کے لیے پیدا کیا ہو، مگر یہ مدارس اُن کی اہلیت اور ذوق ورجحان سے قطع نظر اُنھیں عالم بناتے اور شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد زندگی کے کسی دوسرے شعبے کا انتخاب کر لینے کے مواقع اُن کے لیے ختم کر دیتے ہیں۔ پھر جن کو عالم بناتے ہیں، بارہ سال کی عمومی تعلیم سے محرومی کے باعث اُن کی شخصیت کو بھی ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں جس سے وہ اپنے ہی معاشرے میں اجنبی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اِس غلطی کے نتائج اب پوری قوم بھگت رہی ہے۔ چنانچہ ناگزیر ہے کہ دینی تعلیم کے اداروں کو بھی اختصاصی تعلیم کے دوسرے اداروں کی طرح پابند کیا جائے کہ بارہ سال کی عمومی تعلیم کے بغیر وہ کسی طالب علم کو اپنے اداروں میں داخل نہیں کریں گے۔

ہم پورے اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ تنہا یہی اقدام اُس صورت حال کو تبدیل کر دے گا جو اِس وقت دینی تعلیم کے اداروں نے پیدا کر رکھی ہے۔ لیکن اِس کے لیے ضروری ہے کہ عمومی تعلیم کا نظام جو مہارت ہر شعبۂ زندگی میں اختصاصی تعلیم کے لیے فراہم کرتا ہے، وہ دین کا عالم بننے کے لیے بھی فراہم کرے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ اِس کے لیے عمومی تعلیم کے چند منتخب اداروں میں بالکل اُسی طرح ایک دینیات گروپ شروع کیا جائے، جس طرح سائنس اور آرٹس کے گروپ اِس وقت موجود ہیں تاکہ جو طلبہ دین کے عالم بننا چاہتے ہوں، وہ اپنی تعلیم کے نویں سال سے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اِس گروپ کا انتخاب کریں اور اِس شعبے کی اختصاصی تعلیم کے اداروں میں داخلے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کر لیں۔

تیسری یہ کہ انتہا پسندی سے نجات کے لیے اُس ریاست کا خاتمہ ضروری ہے جو علما کو جمعہ کے منبر اور مساجد کے اہتمام سے ہمارے ملک میں حاصل ہو چکی ہے۔ اہل علم اِس حقیقت سے واقف ہیں کہ نماز جمعہ کے بارے میں جو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم کی، وہ یہ تھی کہ اُس کی امامت اور اُس کا خطاب سربراہ حکومت اور اُس کے عمال کریں گے۔ اُن کے سوا کوئی دوسرا شخص اگر اُن کی کسی معذوری کی صورت میں جمعہ کے منبر پر کھڑا ہو گا تو اُن کی اجازت سے اور اُن کے قائم مقام کی حیثیت سے کھڑا ہو گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی یہ سنت پوری شان کے ساتھ قائم رہی، لیکن بعد کے زمانوں میں جب حکمران اپنے اعمال کی وجہ سے اِس کے اہل نہیں رہے تو جمعہ کا منبر خود اُنھوں نے علما کے سپرد کر دیا۔ مذہب کے نام پر فتنہ وفساد کو اصلی طاقت اِسی سے حاصل ہوئی۔ یہ صورت حال تبدیل ہونی چاہیے اور ہمارے حکمرانوں کو پورے عزم و جزم کے ساتھ فیصلہ کرنا چاہیے کہ اِس نماز کا اہتمام اب حکومت کرے گی اور یہ صرف اُنھی مقامات پر ادا کی جائے گی جو ریاست کی طرف سے اِس کے لیے مقرر کر دیے جائیں گے۔ اِس کا منبر حکمرانوں کے لیے خاص ہو گا۔ وہ خود اِس نماز کا خطبہ دیں گے اور اِس کی امامت کریں گے یا اُن کی طرف سے اُن کا کوئی نمائندہ یہ ذمہ داری ادا کرے گا۔ ریاست کے حدود میں کوئی شخص اپنے طور پر اِس نماز کا اہتمام نہیں کر سکے گا۔

اِسی طرح فیصلہ کرنا چاہیے کہ عام نمازوں کی مسجدیں بھی حکومت کی اجازت سے بنائی جائیں گی۔ وہ کسی خاص فرقے یا مکتب فکر کی مسجدیں نہیں ہوں گی، بلکہ خدا کی مسجدیں ہوں گی، جہاں تنہا اُسی کی عبادت کی جائے گی۔ مسجد مسلمانوں کا ایک اجتماعی ادارہ ہے، اُسے افراد اور تنظیموں کے کنٹرول میں نہیں دیا جا سکتا۔ چنانچہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کی حکومت جہاں بھی قائم ہو، وہ مسجدوں پر اپنا اقتدار پوری قوت کے ساتھ قائم رکھے اور کسی شخص کو اجازت نہ دے کہ وہ اُنھیں کسی تنظیم، تحریک یا کسی خاص نقطۂ نظر کی اشاعت کے لیے استعمال کرے اور اِس طرح خدا کی عبادت گاہوں کے بجاے اُنھیں مسلمانوں کے درمیان تفریق کے مراکز میں تبدیل کر دے۔

یہ اقدام ناگزیر ہے۔ اِس کی برکات اگر کوئی شخص دیکھنا چاہے تو اُن ملکوں میں جا کر دیکھ سکتا ہے، جہاں مسجدوں کے انتظام وانصرام کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

---

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

حج و عمرہ

یہ دونوں عبادات دین ابراہیمی میں عبادت کا منتہاے کمال ہیں۔ اِن کی تاریخ اُس منادی سے شروع ہوتی ہے جو ابراہیم علیہ السلام نے مسجد حرام کی تعمیر کے بعد کی تھی کہ لوگ خداوند کی نذر چڑھانے کے لیے آئیں اور توحید پر ایمان کا جو عہد اُنھوں نے باندھ رکھا ہے، اُسے یہاں آکر تازہ کریں۔

اپنے معبود کے لیے جذبۂ پرستش کا یہ آخری درجہ ہے کہ اُس کے طلب کرنے پر بندہ اپنا جان و مال، سب اُس کے حضور میں نذر کر دینے کے لیے حاضر ہو جائے۔ حج و عمرہ اِسی نذر کی تمثیل ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی حقیقت کو ممثل کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عمرہ اجمال ہے اور حج اِس لحاظ سے اُس کی تفصیل کر دیتا ہے کہ اِس سے وہ مقصد بھی بالکل نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے جس کے لیے جان و مال نذر کر دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ آدم کی تخلیق سے اُس کی جو اسکیم دنیا میں برپا ہوئی ہے، ابلیس نے پہلے دن ہی سے اُس کے خلاف اعلان جنگ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ کے بندے اب قیامت تک کے لیے اپنے اِس ازلی دشمن اور اِس کی ذریت کے خلاف برسر جنگ ہیں۔ یہی اِس دنیا کی آزمایش ہے جس میں کامیابی اور ناکامی پر انسان کے ابدی مستقبل کا انحصار ہے۔ اپنا جان و مال ہم اِسی جنگ کے لیے اللہ کی نذر کرتے ہیں۔ ابلیس کے خلاف اِس جنگ کو حج میں ممثل کیا گیا ہے۔ یہ تمثیل اِس طرح ہے:

اللہ کے بندے اپنے پروردگار کی ندا پر دنیا کے مال و متاع اور اُس کی لذتوں اور مصروفیتوں سے ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ پھر 'لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ' کہتے ہوئے میدان جنگ میں پہنچتے اور بالکل مجاہدین کے طریقے پر ایک وادی میں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔

اگلے دن ایک کھلے میدان میں پہنچ کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے، اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعا و مناجات کرتے اور اپنے امام کا خطبہ سنتے ہیں۔

تمثیل کے تقاضے سے نمازیں قصر اور جمع کر کے پڑھتے اور راستے میں مختصر پڑاؤ کرتے ہوئے دوبارہ اپنے ڈیروں پر پہنچ جاتے ہیں۔

پھر شیطان پر سنگ باری کرتے، اپنے جانوروں کی قربانی پیش کر کے اپنے آپ کو خداوند کی نذر کرتے، سر منڈاتے اور نذر کے پھیروں کے لیے اصل معبد اور قربان گاہ میں حاضر ہو جاتے ہیں۔

پھر وہاں سے لوٹتے اور اگلے دو یا تین دن اِسی طرح شیطان پر سنگ باری کرتے رہتے ہیں۔

اِس لحاظ سے دیکھیے تو حج و عمرہ میں احرام اِس بات کی علامت ہے کہ بندۂ مومن نے دنیا کی لذتوں، مصروفیتوں اور مرغوبات سے ہاتھ اٹھا لیا ہے اور دو اَن سلی چادروں سے اپنا بدن ڈھانپ کر وہ برہنہ سر اور کسی حد تک برہنہ پا بالکل راہبوں کی صورت بنائے ہوئے اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا ہے۔

تلبیہ اُس صدا کا جواب ہے جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے بیت الحرام کی تعمیر نو کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک پتھر پر کھڑے ہو کر بلند کی تھی۔ اب یہ صدا دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ چکی ہے اور اللہ کے بندے اُس کی نعمتوں کا اعتراف اور اُس کی توحید کا اقرار کرتے ہوئے اِس صدا کے جواب میں 'لَبَّیْکَ، اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ' کا یہ دل نواز ترانہ پڑھتے ہیں۔

طواف نذر کے پھیرے ہیں۔ دین ابراہیمی میں یہ روایت قدیم سے چلی آرہی ہے کہ جس کی قربانی کی جائے یا جس کو معبد کی خدمت کے لیے نذر کیا جائے، اُسے معبد یا قربان گاہ کے سامنے پھرایا جائے۔

حجر اسود کا استلام تجدید عہد کی علامت ہے۔ اِس میں بندہ اِس پتھر کو تمثیلاً اپنے پروردگار کا ہاتھ قرار دے کر اِس ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتا اور عہد و میثاق کی قدیم روایت کے مطابق اِس کو چوم کر اپنے اِس عہد کی تجدید کرتا ہے کہ اسلام قبول کر کے وہ جنت کے عوض اپنا جان و مال، سب اللہ کے سپرد کر چکا ہے۔

سعی اسمٰعیل علیہ السلام کی قربان گاہ کا طواف ہے۔ سیدنا ابراہیم نے صفا کی پہاڑی پر کھڑے ہو کر اِس قربان گاہ کو دیکھا تھا اور پھر حکم کی تعمیل کے لیے ذرا تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے مروہ کی طرف گئے تھے۔ چنانچہ صفا و مروہ کا یہ طواف بھی نذر کے پھیرے ہیں جو پہلے معبد کے سامنے اور اِس کے بعد قربانی کی جگہ پر لگائے جاتے ہیں۔

عرفات معبد کا قائم مقام ہے، جہاں شیطان کے خلاف اِس جنگ کے مجاہدین جمع ہوتے، اپنے گناہوں کی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

معافی مانگتے اور اِس جنگ میں کامیابی کے لیے دعاومناجات کرتے ہیں۔

مزدلفہ راستے کا پڑاؤ ہے، جہاں وہ رات گزارتے اور صبح اُٹھ کر میدان میں اترنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر دعاومناجات کرتے ہیں۔

رمی ابلیس پر لعنت اور اُس کے خلاف جنگ کی علامت ہے۔ یہ عمل اِس عزم کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ بندۂ مومن ابلیس کی پسپائی سے کم کسی چیز پر راضی نہ ہوگا۔ یہ معلوم ہے کہ انسان کا یہ ازلی دشمن جب وسوسہ انگیزی کرتا ہے تو اِس کے بعد خاموش نہیں ہوجاتا، بلکہ یہ سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ تاہم مزاحمت کی جائے تو اِس کی تاخت بتدریج کمزور ہوجاتی ہے۔ تین دن کی رمی اور اِس کے لیے پہلے بڑے اور اِس کے بعد چھوٹے جمرات کی رمی سے اِسی بات کو ظاہر کیا گیا ہے۔

قربانی جان کا فدیہ ہے اور سر کے بال مونڈنا اِس بات کی علامت ہے کہ نذر پیش کر دی گئی اور اب بندہ اپنے خداوند کی اطاعت اور دائمی غلامی کی اِس علامت کے ساتھ اپنے گھر لوٹ سکتا ہے۔

اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس قدر غیر معمولی عبادت ہے جو ہر صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں کم سے کم ایک مرتبہ فرض کی گئی ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حج وعمرہ کا مقصد

حج وعمرہ کا مقصد وہی ہے جو اِن کی حقیقت ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اعتراف، اُس کی توحید کا اقرار اور اِس بات کی یاددہانی کہ اسلام قبول کر کے ہم اپنے آپ کو پروردگار کی نذر کر چکے ہیں۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کی معرفت اور دل و دماغ میں جن کے رسوخ کو قرآن نے مقامات حج کے منافع سے تعبیر کیا ہے۔ یہ مقصد ذکر کے اُن الفاظ سے نہایت خوبی کے ساتھ واضح ہوتا ہے جو اِس عبادت کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اِسی مقصد کو نمایاں رکھنے اور ذہنوں میں پوری طرح راسخ کر دینے کے لیے منتخب کیے گئے ہیں۔ چنانچہ احرام باندھ لینے کے بعد یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر مسلسل جاری رہتے ہیں:

لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ؛ لَبَّيْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ، لَبَّيْكَ؛ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ؛ لَاشَرِيْكَ لَكَ.

”میں حاضر ہوں، اے اللہ، میں حاضر ہوں؛ حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں؛ حمد تیرے لیے ہے، سب نعمتیں تیری ہیں اور بادشاہی بھی تیرے ہی لیے ہے؛ تیرا کوئی شریک نہیں۔“

حج وعمرہ کے ایام

عمرہ کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ پورے سال میں لوگ جب چاہیں، کر سکتے ہیں۔ حج کے لیے، البتہ ۸/ ذوالحجہ سے ۱۳/ ذوالحجہ تک کے ایام مقرر ہیں اور یہ اِنھی ایام میں ہو سکتا ہے۔

حج وعمرہ کا طریقہ

حج وعمرہ کے لیے جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے، وہ یہ ہے:

عمرہ

اِس عبادت کی نیت سے اِس کا احرام باندھا جائے۔

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنی میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں، اِسے حدودِ حرم سے باہر کسی جگہ سے باندھیں؛ اور جو لوگ اِن حدود سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، اُن کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں۔

بیت اللہ میں پہنچنے تک تلبیہ کا ورد جاری رکھا جائے۔

وہاں پہنچ کر بیت اللہ کا طواف کیا جائے۔

پھر صفا و مروہ کی سعی کی جائے۔

ہدی کے جانور ساتھ ہوں تو اُن کی قربانی کی جائے۔

قربانی کے بعد مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کھول دیں۔

یہ احرام ایک اصطلاح ہے۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ اب وہ شہوت کی کوئی بات نہیں کریں گے؛ زیب و زینت کی کوئی چیز، مثلاً خوشبو وغیرہ استعمال نہیں کریں گے؛ ناخن نہیں تراشیں گے، نہ جسم کے کسی حصے کے بال اتاریں گے، نہ میل کچیل دور کریں گے، یہاں تک کہ اپنے بدن کی جوئیں بھی نہیں ماریں گے؛ شکار نہیں کریں گے؛ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہنیں گے؛ اپنا سر، چہرہ اور پاؤں کے اوپر کا حصہ کھلا رکھیں گے، اور ایک چادر تہ بند کے طور پر باندھیں گے اور ایک اوڑھ لیں گے۔

عورتیں، البتہ سلے ہوئے کپڑے پہنیں گی اور سر اور پاؤں بھی ڈھانپ سکیں گی۔ اُن کے لیے صرف چہرہ اور

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہاتھ کھلے رکھنے ضروری ہیں۔

میقات اُن جگہوں کو کہتے ہیں جو حج و عمرہ کی غرض سے آنے والوں کے لیے حدود حرم سے کچھ فاصلے پر متعین کر دی گئی ہیں۔ اِن سے آگے وہ احرام کے بغیر نہیں جا سکتے۔ یہ جگہیں پانچ ہیں: مدینہ سے آنے والوں کے لیے ذوالحلیفہ، یمن سے آنے والوں کے لیے یلملم، مصروشام سے آنے والوں کے لیے جحفہ، نجد سے آنے والوں کے لیے قرن اور مشرق کی طرف سے آنے والوں کے لیے ذات عرق۔

تلبیہ سے مراد 'لَبَّيْكَ، اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ؛ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ، لَبَّيْكَ؛ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ؛ لَا شَرِيْكَ لَكَ' کا ورد ہے جو احرام باندھتے ہی شروع ہوتا اور بیت اللہ میں پہنچنے تک برابر جاری رہتا ہے۔ حج و عمرہ کے لیے تنہا یہی ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے۔

طواف کا لفظ اُن سات پھیروں کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر طرح کی نجاست سے پاک ہو کر بیت اللہ کے گرد لگائے جاتے ہیں۔ اِن میں سے ہر پھیرا حجر اسود* سے شروع ہو کر اُسی پر ختم ہوتا ہے اور ہر پھیرے کی ابتدا میں حجر اسود کا استلام کیا جاتا ہے۔ یہ حجر اسود کو چومنے یا ہاتھ سے اُس کو چھو کر اپنا ہاتھ چوم لینے کے لیے ایک اصطلاح ہے۔ ہجوم کی صورت میں ہاتھ سے یا ہاتھ کی چھڑی سے یا اِس طرح کی کسی دوسری چیز سے اشارہ کر دینا بھی اِس کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

سعی سے مراد صفا و مروہ کا طواف ہے۔ یہ بھی سات پھیرے ہیں جو صفا سے شروع ہوتے ہیں۔ صفا سے مروہ تک ایک اور مروہ سے صفا تک دوسرا پھیرا شمار کیا جاتا ہے۔ اِن میں سے آخری پھیرا مروہ پر ختم ہوتا ہے۔

قربانی کی طرح صفا و مروہ کی یہ سعی بھی بطور تطوع کی جاتی ہے۔ یہ عمرے کا کوئی لازمی حصہ نہیں ہے۔ عمرہ اِس کے بغیر بھی مکمل ہو جاتا ہے۔

ہدی کا لفظ اُن جانوروں کے لیے بولا جاتا ہے جو حرم میں قربانی کے لیے خاص کیے گئے ہوں۔ دوسرے جانوروں سے اُن کو ممیّز رکھنے کے لیے اُن کے جسم پر نشان لگائے جاتے اور گلے میں پٹے ڈالے جاتے ہیں۔

حج

عمرے کی طرح حج کے لیے بھی پہلا کام یہی ہے کہ اِس کی نیت سے اِس کا احرام باندھا جائے۔

باہر سے آنے والے یہ احرام اپنی میقات سے باندھیں؛ مقیم خواہ وہ مکی ہوں یا عارضی طور پر مکہ میں ٹھیرے ہوئے ہوں یا حدود حرم سے باہر، لیکن میقات کے اندر رہتے ہوں، اُن کی میقات وہی جگہ ہے، جہاں وہ مقیم ہیں، وہ وہیں

* یہ بیت اللہ کی پرانی تعمیر کا پتھر ہے جسے تجدید عہد کی علامت کے طور پر اُس کے ایک گوشے میں نصب کیا گیا ہے۔

سے احرام باندھ لیں اور تلبیہ پڑھنا شروع کر دیں۔

۸/ ذوالحجہ کو منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں قیام کریں۔

۹/ ذوالحجہ کی صبح عرفات کے لیے روانہ ہوں۔

وہاں پہنچ کر امام ظہر کی نماز سے پہلے حج کا خطبہ دے، پھر ظہر اور عصر کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے۔

نماز سے فارغ ہو کر جتنی دیر کے لیے ممکن ہو، اللہ تعالیٰ کے حضور میں تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل اور دعا و مناجات کی جائے۔

غروب آفتاب کے بعد مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں۔

وہاں پہنچ کر مغرب اور عشا کی نماز جمع اور قصر کر کے پڑھی جائے۔

رات کو اِسی میدان میں قیام کیا جائے۔

فجر کے بعد یہاں بھی تھوڑی دیر کے لیے عرفات ہی کی طرح تسبیح و تحمید، تکبیر و تہلیل اور دعا و مناجات کی جائے۔

پھر منیٰ کے لیے روانہ ہوں اور وہاں جمرۂ عقبہ کے پاس پہنچ کر تلبیہ پڑھنا بند کر دیا جائے اور اِس جمرے کو سات کنکریاں ماری جائیں۔

ہدی کے جانور ساتھ ہوں یا نذر اور کفارے کی کوئی قربانی واجب ہو چکی ہو تو یہ قربانی کی جائے۔

پھر مرد سر منڈوا کر یا حجامت کرا کے اور عورتیں اپنی چوٹی کے آخر سے تھوڑے سے بال کاٹ کر احرام کا لباس اتار دیں۔

پھر بیت اللہ پہنچ کر اُس کا طواف کیا جائے۔

احرام کی تمام پابندیاں اِس کے ساتھ ہی ختم ہو جائیں گی، اِس کے بعد اگر شوق ہو تو بطور تطوع صفا و مروہ کی سعی بھی کی جائے۔

پھر منیٰ واپس پہنچ کر دو یا تین دن قیام کیا جائے اور روزانہ پہلے جمرۃ الاولیٰ، پھر جمرۃ الوسطیٰ اور اِس کے بعد جمرۃ الاخریٰ کو سات سات کنکریاں ماری جائیں۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے حج و عمرہ کے مناسک یہی ہیں۔ قرآن نے اِن میں کوئی تبدیلی نہیں کی، صرف اتنا کیا ہے کہ اِن سے متعلق بعض فقہی احکام کی توضیح فرما دی ہے۔

یہ احکام درج ذیل ہیں:

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

پہلا حکم یہ ہے کہ حج و عمرہ کے تعلق سے جو حرمتیں اللہ تعالیٰ نے قائم کر دی ہیں، اُن کی تعظیم ایمان کا تقاضا ہے، وہ ہر حال میں قائم رہنی چاہییں۔ تاہم کوئی دوسرا فریق اگر اُنھیں ملحوظ رکھنے سے انکار کر دیتا ہے تو اِس کے بدلے میں مسلمانوں کو بھی حق ہے کہ وہ برابر کا اقدام کریں، اِس لیے کہ اِس طرح کی حرمتیں باہمی طور پر ہی قائم رہ سکتی ہیں، اُنھیں کوئی فریق اپنے طور پر قائم نہیں رکھ سکتا۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ اِس اجازت کے باوجود مسلمان اپنی طرف سے کوئی پیش قدمی نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ کی حرمتیں ہیں، اِن کے توڑنے میں پہل ایک بدترین جرم ہے۔ اِس کا ارتکاب کسی حال میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔

تیسرا حکم یہ ہے کہ حالت احرام میں شکار کی ممانعت صرف خشکی کے جانوروں کے لیے ہے، دریائی جانوروں کا شکار کرنا یا دوسروں کا کیا ہوا شکار کھالینا، دونوں جائز ہیں۔ تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ لوگ اِس رخصت سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ خشکی کا شکار ہر حال میں ممنوع ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے اِس گناہ کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اُسے کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

اِس کی تین صورتیں ہیں:

جس طرح کا جانور شکار کیا گیا ہے، اُسی قبیل کا کوئی جانور گھریلو چوپایوں میں سے قربانی کے لیے بیت اللہ بھیجا جائے۔

اگر یہ ممکن نہ ہو تو اُس جانور کی قیمت کی نسبت سے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے۔

یہ بھی دشوار ہو تو اتنے روزے رکھے جائیں، جتنے مسکینوں کو کھانا کھلانا کسی شخص پر عائد ہوتا ہے۔

رہی یہ بات کہ جانوروں کا بدل کیا ہے یا اگر جانور کی قربانی متعذر ہے تو اُس کی قیمت کیا ہوگی یا اُس کے بدلے میں کتنے مسکینوں کو کھانا کھلایا جائے یا کتنے روزے رکھے جائیں گے تو اِس کا فیصلہ مسلمانوں میں سے دو ثقہ آدمی کریں گے تاکہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کے لیے اپنے نفس کی جانب داری کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

چوتھا حکم یہ ہے کہ حج و عمرہ کے لیے سفر کرنے والے اگر کسی جگہ گھر جائیں اور اُن کے لیے آگے جانا ممکن نہ رہے تو اونٹ، گائے، بکری میں سے جو میسر ہو، اُسے قربانی کے لیے بھیج دیں یا بھیجنا ممکن نہ ہو تو اُسی جگہ قربانی کر دیں اور سر منڈوا کر احرام کھول دیں۔ اُن کا حج و عمرہ یہی ہے۔ اِس معاملے میں یہ بات، البتہ واضح رہنی چاہیے کہ قربانی اِس طرح کی کسی جگہ پر کی جائے یا مکہ اور منیٰ میں، اُس سے پہلے سر منڈوانا جائز نہیں ہے، الّا یہ کہ کوئی شخص بیمار ہو یا اُس کے سر میں کوئی تکلیف ہو اور وہ قربانی سے پہلے ہی سر منڈوانے پر مجبور ہو جائے۔ قرآن نے اجازت دی

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

ہے کہ اِس طرح کی کوئی مجبوری پیش آ جائے تو لوگ سر منڈوا لیں، لیکن روزوں یا صدقے یا قربانی کی صورت میں اُس کا فدیہ دیں اور اُن کی تعداد اور مقدار اپنی صواب دید سے جو مناسب سمجھیں طے کر لیں۔

پانچواں حکم یہ ہے کہ باہر سے آنے والے اگر ایک ہی سفر میں حج و عمرہ، دونوں کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کھول دیں، پھر ۸/ ذوالحجہ کو مکہ ہی میں دوبارہ احرام باندھ کر حج کر لیں۔ یہ محض ایک رخصت ہے جو اللہ تعالیٰ نے دو مرتبہ سفر کی زحمت کے پیش نظر باہر سے آنے والے عازمین حج کو عطا فرمائی ہے۔ لہٰذا وہ اِس کا فدیہ دیں گے۔ اِس کی دو صورتیں ہیں:

اونٹ، گائے اور بکری میں سے جو جانور بھی میسر ہو، اُس کی قربانی کی جائے۔

یہ ممکن نہ ہو تو دس روزے رکھے جائیں: تین حج کے دنوں میں اور سات حج سے واپسی کے بعد۔

اِس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر یہی ہے کہ حج کے لیے الگ اور عمرے کے لیے الگ سفر کیا جائے۔ چنانچہ قرآن نے صراحت کر دی ہے کہ یہ رعایت اُن لوگوں کے لیے نہیں ہے جن کے گھر درمسجد حرام کے پاس ہوں۔

چھٹا حکم یہ ہے کہ منیٰ سے ۱۲/ ذوالحجہ کو بھی واپس آ سکتے ہیں اور چاہیں تو ۱۳/ ذوالحجہ تک بھی ٹھیر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ دونوں ہی صورتوں میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اِس لیے کہ اصل اہمیت اِس کی نہیں کہ لوگ کتنے دن ٹھیرے، بلکہ اِس کی ہے کہ جتنے دن بھی ٹھیرے، خدا کی یاد میں اور اُس سے ڈرتے ہوئے ٹھیرے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محمد وسیم اختر مفتی

حضرت اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا

حضرت اسماء حضرت ابوبکر (عبداللہ) کی سب سے بڑی صاحب زادی تھیں۔ ہجرت نبوی سے ستائیس برس قبل پیدا ہوئیں۔ تب سیدنا ابوبکر کی عمر بیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ ابوقحافہ (عثمان) ان کے دادا اور تیم بن مرہ جد تھے جن کے نام پر ان کا قبیلہ بنو تیم کہلاتا تھا۔ مرہ پر ان کا شجرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شجرے سے جا ملتا ہے۔ کلاب بن مرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جبکہ تیم بن مرہ حضرت اسماء کے جد تھے۔ ان کی والدہ کا نام قُتیلہ (یا قُتلہ یا قیلہ) تھا، ام العزیٰ ان کی کنیت تھی۔ وہ قریش کی شاخ بنو عامر بن لوی سے تھیں۔ عبدالعزیٰ بن اسعد حضرت اسماء کے نانا تھے۔ سیدہ عائشہ بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا ان کی سوتیلی بہن تھیں اور ان سے چھوٹی تھیں۔ عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ ان کے سگے بھائی تھے۔ سیدہ عائشہ کی والدہ کا نام ام رومان تھا۔ ام عبداللہ اسماء رضی اللہ عنہا کی کنیت تھی۔

حضرت اسماء بنت ابوبکر نے کم سنی ہی میں ایمان کی طرف سبقت کی۔ السابقون الاولون کی فہرست میں ان کا نمبر اٹھارواں یا انیسواں ہے۔

حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں نے زمانۂ جاہلیت کے موحد زید بن عمرو بن نفیل کو دیکھا تو وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے، کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے خطاب کر رہے تھے۔ کہا: قریش کے لوگو، قسم اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں زید بن عمرو کی جان ہے، تم میں دین ابراہیمی پر میرے سوا کوئی عمل پیرا نہیں رہا۔ اے اللہ، اگر میں جانتا ہوتا کہ کون سا طریقۂ عبادت تمھیں محبوب ترین ہے، تو اسی کے مطابق تیری بندگی کرتا، لیکن مجھے علم نہیں۔ پھر اپنی ہتھیلی پر سجدہ کر لیتے۔ وہ ان بچیوں کو بچا لیتے جنھیں ان کے والدین زندہ گاڑنا چاہتے۔ ان کی کفالت کرتے، جب جوان ہو جاتیں تو ان کے والدین کو واپس لینے کی پیش کش کرتے۔ وہ تب بھی نہ مانتے تو ان کی کفالت جاری رکھتے۔ اپنے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

ہم وطنوں کو زنا سے بچنے کی نصیحت کرتے (بخاری، رقم ۳۸۲۸)۔حضرت اسماء نے زید کے توحید کی تلقین پر مبنی اشعار بھی روایت کیے ہیں۔

سیدہ عائشہ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر صبح یا شام کے وقت تشریف لاتے تھے۔ایک دن آپ عین دوپہر کے وقت آئے، دھوپ خوب تیز تھی۔ان اوقات میں آنا آپ کا معمول نہ تھا،اس لیے میرے والد سیدنا ابوبکر نے کہا: آپ کی اس وقت تشریف آوری کا مطلب یہی ہے کہ کوئی اہم معاملہ درپیش ہے۔انھوں نے آپ کو چارپائی پر بٹھایا۔میں اور اسماء بھی گھر میں تھیں۔آپ نے علیحدگی میں بات کرنے کو فرمایا تو سیدنا ابوبکر نے بتایا: میری ان دو بیٹیوں کے علاوہ یہاں کوئی موجود نہیں۔آپ نے فرمایا: اللہ نے مجھے مکہ سے نکل جانے اور ہجرت کرنے کی اجازت دے دی ہے (بخاری، رقم ۲۱۳۸)۔سیدنا ابوبکر کے گھر کے چھوٹے عقبی دروازے (خوخہ) ہی سے آپ غار ثور کو روانہ ہوئے، یہ ہجرت کی پہلی منزل تھی۔آپ کے جانے کی اطلاع سیدنا ابوبکر کے گھرانے کے علاوہ صرف سیدنا علی کو تھی۔سیدنا علی کی ذمہ داری تھی کہ آپ کے جانے کے بعد آپ کے بستر پر سوئیں اور آپ کے پاس موجود لوگوں کی امانتیں انھیں لوٹا دیں۔آپ نے تین دن غار ثور میں قیام کیا۔اس دوران میں سیدنا ابوبکر کے آزاد کردہ حضرت عامر بن فہیرہ ان کی بکریوں کا ریوڑ لے کر جاتے تو آپ ان کا دودھ پی لیتے۔ابن اسحاق کا کہنا ہے کہ روزانہ شام کے وقت حضرت اسماء کھانا تیار کر کے لاتیں۔تیسرے دن اسماء دونوں کے لیے توش دان لے کر آئیں لیکن اسے لٹکانے والی ڈوری لانا بھول گئیں۔آپ سفر پر روانہ ہونے لگے تو وہ اونٹنی سے توشہ دان لٹکانے لگیں، ڈوری نہ ملی تو سیدنا ابوبکر کے کہنے پر اپنا کمر بند کھول لیا،اس کا ایک حصہ پھاڑ کر الگ کر لیا،اس کی رسی بنا کر توشہ دان لٹکایا اور دوسرا پھر کمر سے باندھ لیا۔بخاری کی روایت ذرا مختلف ہے۔حضرت اسماء خود بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کا ارادہ فرمایا تو میں نے اپنے والد سیدنا ابوبکر کے گھر میں آپ کا توشہ دان تیار کیا۔آپ کے توشہ دان اور مشکیزے کو باندھنے کے لیے اپنے کمر بند کے علاوہ کچھ نہ ملا تو والد نے کہا: اسے پھاڑ کر دو حصے کر لو۔ایک سے پانی کی مشک اور دوسرے سے توشہ دان کو باندھ لو (رقم ۲۹۷۹)۔اس طرح ایک نطاق (کمر بند) کے نطاقین (دو کمر بند) بن گئے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمھیں اس ایک کمر بند کے بدلے میں جنت میں دو کمر بند عطا کرے گا۔تب سے ذات النطاقین (دو کمر بندوں والی) ان کا لقب ہو گیا (بخاری، رقم ۳۹۰۵)۔

آپ کو رخصت کر کے حضرت اسماء مکہ پہنچیں تو قریش کے لوگ ابوجہل کی سربراہی میں ان کے گھر آئے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت اسماء باہر نکلیں تو پوچھا: بنت ابوبکر، تمھارے ابا کہاں ہیں؟ انھوں نے جواب دیا مجھے کیا معلوم۔ ابوجہل بہت بدزبان اور بدطینت تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر حضرت اسماء کے گال پر اس زور سے تھپڑ جڑ دیا کہ ان کی بالی گر گئی۔ حضرت اسماء کہتی ہیں: تین دن گزرے تھے کہ زیریں مکہ سے ایک شخص یہ اشعار گنگناتا ہوا آیا:

جزی اللّٰہ رب الناس خیرجزائہ رفیقین حلا خیمتی ام معبد

''اللہ، لوگوں کا رب، ان دونوں ساتھیوں کو بہترین جزا دے جو بنوکعب کی عورت ام معبد کے خیموں میں ٹھہرے۔''

ھما نزلا بالبر ثم تروحا فافلح من امسی رفیق محمد

''وہ دونوں بیابان میں ٹھہرے پھر سفر جاری رکھا تو جو محمد کا ساتھی بنا کامیاب ہوا۔''

تب ہمیں معلوم ہو گیا کہ آپ مدینہ کی طرف منزلیں طے کر رہے ہیں۔ حضرت اسماء مزید بیان کرتی ہیں کہ سیدنا ابوبکر کے پاس پانچ یا چھ ہزار درہم موجود تھے، وہ ساری رقم اپنے ساتھ لے گئے۔ میرے دادا ابوقحافہ نے پوچھا: لگتا ہے، ابوبکر نے مال لے جا کر تمھیں پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ میں نے انھیں مطمئن کرنے کے لیے کچھ پتھر لے کر گھر کے اس خفیہ خانے میں رکھ دیے جہاں سیدنا ابوبکر مال رکھا کرتے تھے۔ اوپر کپڑا ڈال کر میں نے اپنے نابینا دادا سے کہا: اسے ہاتھ سے ٹٹول لیں۔ وہ خوش ہو گئے اور کہا: اگر وہ اتنا مال چھوڑ گئے ہیں تو خیر ہے۔

حضرت اسماء بنت ابوبکر کا بیاہ ہجرت سے پہلے مکہ میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی حضرت زبیر بن عوام سے ہوا۔ مدینہ ہجرت کے وقت وہ حاملہ تھیں۔ عبداللہ بن زبیر پہلے بچے تھے جو مہاجرین کی مدینہ آمد کے فوراً بعد قبا میں پیدا ہوئے۔ واقدی کی روایت درست نہیں کہ وہ شوال ۲ھ میں پیدا ہوئے۔ حضرت اسماء کہتی ہیں کہ میں نومولود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائی۔ آپ نے اسے گود میں بٹھایا، کھجور منگا کر اسے چبایا اور پھر اپنا لعاب دہن اس کے منہ میں لگایا۔ پہلی شے جو اس کے پیٹ میں گئی، آپ کا لعاب تھا جس میں کھجور کی آمیزش تھی (بخاری، رقم ۳۹۰۹)۔ آپ ہی نے اس کا نام عبداللہ رکھا اور اس کے لیے برکت کی دعا کی (مسلم، رقم ۵۶۲۷)۔ اسماء اور زبیر کے ہاں کل آٹھ بچے ہوئے۔ ان کے نام یہ ہیں: عبداللہ، عروہ، منذر، عاصم، مہاجر، خدیجہ، ام حسن اور عائشہ۔

مدینہ کے ابتدائی ایام میں حضرت اسماء کی زندگی بڑی کٹھن تھی جو انھوں نے بڑے صبر و قناعت سے بسر کی۔ خود بیان کرتی ہیں: ''زبیر نے مجھ سے شادی کی تو ان کے پاس مال تھا نہ غلام۔ ایک گھوڑے اور ایک اونٹنی کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ میں ہی گھوڑے کو چارہ دیتی، اس کی ضرورتیں پوری کرتی اور اس کی دیکھ بھال کرتی۔ اونٹنی کی خوراک

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

کے لیے کھجوروں کی گٹھلیاں پیستی، اس کا چارہ تیار کرتی، اسے پانی پلاتی، اس کا چمڑے کا ڈول سیتی۔ میں ہی گھر کے لیے پانی ڈھوتی۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زبیر کو بنو نضیر کے علاقہ میں ایک قطعۂ زمین (یا کھجوروں کا باغ) عطا کیا جو ان کے گھر سے چھ میل دور تھا۔ حضرت اسماء پیدل یہ فاصلہ طے کرتیں اور سر پر کھجوروں کی گٹھلیاں لاد کر لاتیں۔ ایک دفعہ آپ کچھ انصاری صحابہ کے ساتھ گزر رہے تھے کہ اسماء کو جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ آپ نے انھیں اپنے پیچھے اونٹ پر بیٹھنے کو کہا، لیکن اسماء نے مردوں کے ساتھ جانے میں شرم محسوس کی، پھر انھیں زبیر کے مزاج کا خیال آیا، وہ اس بات کو اچھا نہ سمجھتے۔ آپ نے ان کی جھجک اور شرم کو دیکھتے ہوئے اصرار نہ کیا۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر نے اپنی بیٹی کے لیے ایک خادم بھیج دیا جو گھوڑے کو سنبھالنے لگا۔ زبیر کو اس واقعے کا پتا چلا تو کہا: تمھارا سر پر گٹھلیاں اٹھانا آپ کے ساتھ آنے سے زیادہ گراں تھا۔ اسماء مزید کہتی ہیں کہ میں آٹا گوندھ لیتی تھی، لیکن روٹی اچھی طرح پکانی نہ آتی تھی۔ میری انصاری پڑوسنیں بہت اچھی تھیں، وہ میری روٹیاں پکا دیتیں (بخاری، رقم ۵۲۲۴۔ مسلم، رقم ۵۷۴۳)۔

ایک بار حضرت اسماء کی گردن میں ورم آ گیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سوجن پر ہلکی مالش کی۔ آپ یہ دعا بھی فرماتے جاتے تھے کہ اللہ، اسماء کو اس کے برے اثرات اور ہونے والی تکلیف سے چھٹکارا دے دے۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر جب دیکھتیں کہ کسی عورت کو بخار چڑھا ہے تو پانی لے کر اس کے جسم پر ڈالتیں اور کہتیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ بخار کو پانی سے ٹھنڈا کریں (بخاری، رقم ۵۷۲۴)۔

۱۰ھ میں حجۃ الوداع ہوا۔ طواف زیارت اور عمرہ کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کے پاس قربانی کا جانور ہے وہ احرام باندھے رکھے، یعنی حج قران کرے۔ جس کے پاس ہدی نہیں، وہ احرام کھول دے اور حج تمتع کرے۔ حضرت اسماء کے پاس ہدی نہ تھی، انھوں نے احرام کھول دیا۔ ان کے شوہر زبیر کے پاس قربانی کا جانور تھا، انھوں نے احرام باندھے رکھا۔ اسماء کپڑے بدل کر زبیر کے پاس جا بیٹھیں تو انھوں نے اٹھ جانے کو کہا، اسماء بولیں: کیا آپ کو اندیشہ ہے کہ میں آپ پر کود پڑوں گی؟ (مسلم، رقم ۲۹۷۶)۔ عرفات سے واپسی پر حضرت اسماء نے مزدلفہ میں رات بسر کی۔ نوافل ادا کرنے کھڑی ہوئیں، ایک گھنٹا گزرا تو اپنے غلام سے پوچھا: بیٹا، کیا چاند غروب ہو گیا؟ اس نے نہیں کہا تو دوبارہ نفل پڑھنے شروع کر دیے، ایک گھنٹے کے بعد پھر پوچھا: کیا چاند غروب ہو گیا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا تو چلنے کو کہا۔ منیٰ پہنچ کر شیطانوں کو کنکریاں ماریں اور فجر کی نماز اپنی قیام گاہ میں ادا کی۔ غلام نے کہا: اماں جان، ہم تو منہ اندھیرے پہنچ گئے ہیں۔ حضرت اسماء نے کہا: بچے، رسول اللہ صلی اللہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

علیہ وسلم نے عورتوں کو اس کی اجازت دے رکھی ہے (بخاری، رقم ۱۶۷۹۔ مسلم، رقم ۱۲۹۱)۔ یہ آپ کے اس فرمان کے برعکس تھا جو آپ نے نوجوانوں کو ارشاد کر رکھا تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے رمی نہ کریں۔ آپ کی وفات کے بعد بھی حضرت اسماء کا یہی دستور رہا۔

حضرت اسماء کا جب بھی جبل حجون سے گزر ہوتا تو فرماتیں کہ اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحمتیں بھیجے۔ ہم ان کے ساتھ اس مقام سے مکہ آئے تھے۔ تب ہم تھوڑے تھے، ہمارا سامان بھی بہت کم تھا۔ میں، میری بہن عائشہ، میرے شوہر زبیر اور فلاں فلاں نے یہاں سے عمرہ کیا تھا۔ بیت اللہ کے طواف کے بعد ہم نے احرام کھولا اور رات کو حج کے لیے پھر باندھ لیا (بخاری، رقم ۱۷۹۶۔ مسلم، رقم ۲۹۷۸)۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں سورج گرہن ہوا تو آپ نے نماز کسوف کی چار رکعتیں پڑھائیں۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر اس میں شریک تھیں۔ نماز کے دوران میں ان کو غشی بھی آئی (بخاری، رقم ۸۶)۔ نماز ختم ہوئی تو گرہن چھٹ چکا تھا۔ غزوۂ بنو مصطلق میں سیدہ عائشہ نے اسماء سے مانگ کر ہار پہنا جو بیدا یا ذات الجیش کے مقام پر ٹوٹ کر گر گیا اور وہ اونٹ اس پر بیٹھ گیا جس پر سیدہ عائشہ سوار تھیں۔ آپ نے ہار کی تلاش کے لیے قافلہ رکوایا۔ اسی دوران میں نماز کا وقت ہو گیا، آس پاس کہیں پانی نہ تھا، کچھ صحابہ کو وضو کیے بغیر نماز پڑھنا پڑی۔ اسی موقع پر آیات تیمّم نازل ہوئیں اور اہل ایمان نے پہلی بار تیمّم کیا (بخاری، رقم ۴۵۸۳۔ مسلم، رقم ۷۴۵)

حضرت اسماء بنت ابوبکر نے اپنے شوہر اور بیٹے کے ساتھ جنگ یرموک میں شرکت کی۔ اسی معرکے میں زبیر بن عوام رومی فوج کی صفوں کو اول سے آخر تک چیرتے ہوئے نکل گئے اور صحیح سلامت لوٹ آئے۔ ابو واقد لیثی کہتے ہیں کہ میں نے اسماء کو زبیر کے ساتھ یہ گفتگو کرتے ہوئے سنا کہ ابوعبداللہ، بخدا، دشمن کا ایک سپاہی دوڑتا ہوا گزرا، اس کے قدم میرے خیمے کی رسی کے کنڈے سے اڑ گئے اور وہ وہیں گر کر مر گیا، وہ کسی کے اسلحے کا نشانہ نہ بنا تھا۔

خلیفۂ دوم سیدنا عمر نے اسماء بنت ابوبکر کا وظیفہ ایک ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔

حضرت اسماء بنت ابوبکر نے عبداللہ بن عمر سے پچھوایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم تین چیزوں کو حرام قرار دیتے ہو: کپڑوں میں ریشمی دھاریوں اور نقوش کا ہونا، سرخ (ارغوانی) زین پوش اور رجب کے پورے مہینے کے روزے رکھنا۔ عبداللہ نے جواب بھیجا کہ جو خود ہمیشہ روزہ رکھتا ہے (یعنی ابن عمر) رجب کے روزوں کو کیسے حرام کہہ سکتا ہے، کپڑوں میں ریشمی نقوش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ریشم کو حرام قرار دینے کے ضمن میں آتے ہیں۔ رہ گیا ارغوانی زین پوش تو خود میرا (عبداللہ بن عمر کا) زین پوش ارغوانی ہے۔ حضرت اسماء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سبز

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

خسروی جبہ نکال کر دکھایا جو آپ پہنا کرتے تھے۔ اس کے گریبان اور دامنوں پر دیبا کی پٹی لگی تھی۔ فرمایا: یہ جبہ سیدہ عائشہ کے پاس تھا، ان کی وفات کے بعد میں نے لے لیا (مسلم، رقم ۵۴۶۰)۔

سعید بن عاص کی گورنری کے زمانہ میں مدینہ میں چوروں کی کثرت ہوگئی تو حضرت اسماء نے ایک خنجر پاس رکھنا شروع کر دیا۔ اسے وہ سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتیں۔

زبیر اسماء کے ساتھ سختی برتتے تھے۔ وہ اپنے والد کے پاس آئیں اور زبیر کی شکایت کی تو انھوں نے کہا: بٹیا، صبر کرو، زبیر نیک انسان ہے۔ امید ہے جنت میں بھی وہی تمھارا شوہر ہو، کیونکہ ایک عورت کا خاوند اگر نیک ہو اور وہ اس کے مرنے کے بعد کسی اور سے شادی نہ کرے تو اللہ جنت میں بھی دونوں کو ساتھ رکھتا ہے۔ ایک بار اسماء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا نبی اللہ، میرے گھر میں وہی کچھ ہے جو زبیر لاتے ہیں۔ کیا مجھے گناہ ہوگا اگر ان کے دیے ہوئے مال میں سے ایک قلیل مقدار سخاوت کر دوں؟ آپ نے فرمایا: جتنی بخشش کر سکتی ہو کر دیا کرو۔ مال گن گن کر رکھنا نہ کنجوسی کرنا، کہیں اللہ بھی اپنی عطا کم نہ کر دے (بخاری، رقم ۱۴۳۳، ۲۵۹۱۔ مسلم، رقم ۲۳۴۲)۔ آپ کی اس تلقین ہی کا نتیجہ تھا کہ سخاوت حضرت اسماء کی طبیعت کا حصہ بن گئی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت اسماء کے مزاج میں بھی تیزی تھی، اس لیے میاں بیوی میں ان بن رہنے لگی۔ کئی سال کی ازدواجی زندگی کے بعد حضرت زبیر بن عوام نے ان کو طلاق دے دی تو وہ اپنے بیٹے عبداللہ کے ساتھ رہنے لگیں۔ چھوٹے بیٹے عروہ والد کے ساتھ چلے گئے۔ حضرت اسماء کی طلاق کے بارے میں کئی قصے بیان کیے گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ نے اپنے والد سے مطالبہ کیا، میری عمر کے آدمی کی والدہ وطی نہیں کی جاتی، لہٰذا انھیں طلاق دے دیں۔ دوسری روایت میں بیان ہوا ہے کہ حضرت اسماء عمر رسیدہ ہو چکی تھیں کہ کسی بات پر زبیر بن عوام نے انھیں پیٹا۔ انھوں نے اپنے بیٹے عبداللہ کو پکارا، وہ آئے تو حضرت زبیر نے کہا: اگر تم اندر آئے تو تمھاری ماں کو طلاق۔ عبداللہ نے کہا: آپ میری ماں کو قسموں کا ہدف بناتے ہیں، پھر کمرے میں داخل ہوئے اور ماں کو چھڑا لیا۔ اس طرح حضرت اسماء کی معلق طلاق واقع ہوئی۔ ۳۶ھ میں جنگ جمل ہوئی۔ حضرت زبیر اس میں شریک تھے، لیکن پھر جنگ چھوڑ کر مدینہ جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ بصرہ سے پانچ میل واپس وادئ سباع تک آئے تھے کہ عمرو بن جرموز نے انھیں قتل کر دیا، حضرت اسماء کو ان کی شہادت کا بہت رنج ہوا۔

سیدہ عائشہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان روایت کیا ہے کہ اگر میری قوم نے نیا نیا کفر نہ چھوڑا ہوتا تو میں کعبہ کو گرا کر اس کی بنیاد زمین سے ملا دیتا، اس کے مشرقی و مغربی دو دروازے بنا دیتا اور شمالی گوشے (حطیم) کے چھ گز

اس میں (دوبارہ) شامل کر دیتا، اس لیے کہ قریش نے کعبہ کی تعمیر کرتے ہوئے (اس کی اصل ابراہیمی بنیادوں کو نظر انداز کرتے ہوئے) انھیں چھوڑ دیا تھا (بخاری، رقم ۱۵۸۶۔ مسلم، رقم ۳۲۲۳)۔ ان کے بھانجے حضرت عبداللہ بن زبیر کا مکہ پر اقتدار قائم ہوا تو انھوں نے اس ارشاد پر عمل کیا۔ انھوں نے آنے جانے کے لیے کعبہ کے دو دروازے بنا دیے۔ حجاج کو غلبہ حاصل ہوا تو اس نے حضرت ابن زبیر کی تبدیلیاں لوٹا دیں۔

مروان بن حکم کی وفات کے وقت بنو امیہ کی حکومت شام تک محدود ہو چکی تھی۔ شام کے علاوہ سارا عالم اسلام حضرت عبداللہ بن زبیر کے تسلط میں تھا۔ عبدالملک بن مروان تخت نشین ہوا تو اس نے چھنے ہوئے علاقے واپس لینا شروع کیے۔ یکے بعد دیگرے فتوحات کے بعد حجاز کی باری آئی۔ یکم ذی قعد ۷۳ھ میں جب حضرت عبداللہ بن زبیر اپنے دارالخلافہ مکہ میں مقیم تھے، حجاج بن یوسف نے چالیس ہزار کی فوج لے کر مکہ کا محاصرہ کیا جو چھ ماہ سترہ دن جاری رہا۔ اس نے مسجد حرام پر سنگ باری کرنے کے لیے منجنیقیں نصب کرائیں اور اعلان کیا کہ ہماری لڑائی محض ابن زبیر سے ہے۔ انھیں تین صورتوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا: مکہ چھوڑ کر جہاں دل چاہے، چلے جائیں یا بیڑیوں میں جکڑ کر شام کو بھیج دیے جائیں یا لڑائی کرتے ہوئے مارے جائیں۔ عبداللہ نے اپنی والدہ حضرت اسماء سے مشورہ کیا تو انھوں نے حجاج کا مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ اس سے حضرت اسماء کی سوجھ بوجھ، ایمان کی پختگی اور ثابت قدمی کا پتا چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے بیٹے کے لیے کفن منگوا کر اسے خوشبو بھی لگوا دی۔ اس طویل محاصرے کے دوران میں حضرت عبداللہ بن زبیر کے دس ہزار ساتھی انھیں چھوڑ کر حجاج سے جا ملے۔ قحط سے تنگ آ کر ان کے دو بیٹوں حمزہ اور خبیب نے بھی حجاج سے امان طلب کر لی۔ وہ اپنی والدہ حضرت اسماء کے پاس آئے اور کہا: اماں جان، گنتی کے چند جاں نثار میرے ساتھ رہ گئے ہیں، اگر میں بھی ہتھیار ڈال دوں تو امان مل جائے گی، آپ کا کیا حکم ہے؟ حضرت اسماء نے جواب دیا: اگر تمھیں یقین ہے کہ تم حق پر ہو اور اسی کی دعوت دے رہے ہو تو اپنی روش پر قائم رہو۔ اگر تم نے حکومت و اقتدار دنیا کے لیے حاصل کیا تھا تو تم سے برا کوئی آدمی نہیں، اپنے آپ کو اور اپنے ساتھ شہید ہونے والوں کو خواہ مخواہ ہلاکت میں ڈالا۔ حضرت عبداللہ نے کہا: مجھے ڈر ہے کہ اہل شام میری لاش کی بے حرمتی کریں گے۔ حضرت اسماء نے کہا: کوئی مضایقہ نہیں، راہ حق پر ڈٹے رہو۔ انھیں گلے لگایا، ہمت بڑھائی اور دعا دی۔ عبداللہ کی شہادت سے دس دن پہلے حضرت عبداللہ اور عروہ دونوں بھائی اپنی والدہ کی خبر گیری کے لیے آئے جو بیمار تھیں۔ کہا: شدید تکلیف میں ہوں جس سے موت ہی نجات دے سکتی ہے۔ لیکن میں دو باتوں میں سے ایک کے ہونے سے قبل مرنا نہیں چاہتی، عبداللہ کو شہادت نصیب ہو اور مجھے اجر کی امید ہو جائے یا یہ فتح یاب ہو جائے اور مجھے

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

سکون مل جائے۔

۱۷ جمادی الاولیٰ ۷۳ھ، بدھ کے روز جب جنگ کا بازار گرم تھا، منجنیق سے پھینکا ہوا ایک روڑا زور سے آ کر حضرت ابن زبیر کے سر پر لگا، وہ گر گئے، اٹھنے کی کوشش کی تو اٹھا نہ جا سکا۔ چنانچہ اپنے بائیں کندھے کا سہارا لیا اور تلوار چلانی شروع کر دی۔ اسی اثنا میں شامی فوجی ان پر ٹوٹ پڑے، ایک نے پاؤں کاٹا، دوسرے نے سر تن سے جدا کر دیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر کی جان لینے کے بعد بھی حجاج کی تشفی نہ ہوئی۔ اس نے ان کا سر مدینہ بھیج دیا پھر عبدالملک بن مروان کے پاس لے جایا گیا، بقیہ دھڑ بالائی مکہ کے جبل حجون کی داہنی گھاٹی کدا کے اوپر ایک تنے سے الٹا لٹکا دیا۔ مسلم کی روایت ہے کہ اس نے انھیں یہودیوں کے قبرستان میں دفن کیا (رقم ۶۵۸۸)۔ ایک روایت کے مطابق حجون پہاڑ کے اسی مقام پر دفنایا گیا جہاں انھیں سولی پر لٹکایا گیا۔ تیسری روایت ہے کہ ان کے زخمی اور کٹے پھٹے جسم کو غسل دینے، کفن پہنانے، خوشبو لگانے اور نماز جنازہ پڑھنے کے بعد حضرت اسماء مدینہ لے گئیں اور صفیہ بنت حیی کے گھر دفن کیا۔ بعد میں یہ گھر مسجد نبوی میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح وہ ابوبکر و عمر کے ہم نشین ہو گئے (تاریخ دمشق)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت اسماء نے سو برس کی عمر پائی۔ مدینہ ہجرت کرنے والی اہل ایمان عورتوں میں سب سے آخر میں انھوں نے وفات پائی۔ ان کی وفات جمادی الاولیٰ ۷۳ھ میں اپنے بیٹے حضرت عبداللہ بن زبیر کے قتل کے کچھ دنوں بعد (دس، بیس یا بیس سے اوپر) ہوئی۔ وہ شدت غم سے نڈھال ہو کر حجاج کے پاس آئیں اور پوچھا: سولی پر چڑھے اس سوار کے اترنے کا وقت نہیں آیا؟ اس نے کہا: ہم دونوں نے اس صلیب پر لٹکنے کا مقابلہ کیا، لیکن یہ جیت کر مصلوب ہونے میں کامیاب ہوا۔ اللہ نے اسے دردناک عذاب دیا ہے اور حق کی تائید کی ہے۔ حضرت اسماء نے کہا: (کبھی) باطل بھی حق پر غالب آ جاتا ہے۔ حجاج نے کہا: تیرا بیٹا منافق تھا، اس نے بیت اللہ میں بے دینی کا ارتکاب کیا۔ حضرت اسماء بولیں: تو جھوٹ کہتا ہے، وہ اہل ایمان کے ہاں پیدا ہونے والا مدینہ کا پہلا بچہ تھا۔ اس کی پیدایش پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے حد مسرور ہوئے، مسلمانوں نے خوشی سے 'اللہ اکبر' کا نعرہ بلند کیا تو مدینہ گونج اٹھا۔ تم اور تمھارے ساتھی اسے قتل کر کے خوش ہو رہے ہو۔ عبداللہ کی پیدایش پر خوش ہونے والے تم سے بہت بہتر تھے۔ واللہ، وہ منافق نہ تھا، وہ تو والدین کا تابع فرمان، روزہ دار، شب بیدار اور عبادت گزار تھا۔ حجاج نے جھڑک دیا، چلی جا، تو ایک بڑھیا ہے جس کی عقل جاتی رہی ہے۔ انھوں نے کہا: میری عقل زائل نہیں ہوئی۔ میں گواہی دیتی ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے کہ بنو ثقیف میں ایک جھوٹا نبی پیدا ہو گا اور ایک قتل و غارت کرنے

والا ہلاکو (مسلم، رقم ۶۵۸۸۔ المعجم الکبیر طبرانی، رقم ۳۷۴)۔ جھوٹا نبی، مختار ثقفی تو ہم نے دیکھ لیا، ہلاکو تو ہے۔ حجاج نے کہا: میں منافقوں کو تباہ کرنے والا ہوں۔ حضرت اسما نے اپنے بیٹے کی میت کے پاس کھڑے ہو کر طویل دعا کی اور ایک آنسو بہائے بغیر لوٹ گئیں۔

عبدالملک بن مروان کو حجاج کی بدتمیزی کا پتا چلا تو اسے برا بھلا کہا: ایک نیک انسان کی بیٹی سے تمھارا تعرض کرنے کا کیا مقصد؟ اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر کو سولی سے اتار کر سپرد خاک کرنے اور حضرت اسماء سے ہم دردی کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت عبداللہ کی تدفین کے بعد حجاج نے حضرت اسماء کو بلایا تو وہ نہ آئیں۔ وہ خود ان کے ہاں گیا اور کہا: اماں جان، امیر المومنین عبدالملک نے مجھے حکم دیا ہے کہ آپ کی ضروریات کا خیال رکھوں۔ حضرت اسماء نے کہا: میں تمھاری ماں ہوں نہ مجھے تم سے کچھ لینا ہے۔ میں تو اس شہید بیٹے کی ماں ہوں جسے تم نے سولی پر لٹکا رکھا تھا۔ تو نے حضرت عبداللہ کی دنیا خراب کی اور اس نے تمھاری آخرت تباہ کر دی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ تم میرے بیٹے کو ذات النطاقین کا بیٹا کہہ کر چڑاتے تھے؟ اس نے کہا: ہاں۔ حضرت اسماء نے کہا: میرا کمر بند ہی تھا جس کے دو ٹکڑے کر کے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مشکیزہ اور توشہ دان باندھے تھے۔ عورتوں کے لیے کمر بند ایک ناگزیر شے ہے (مسلم، رقم ۶۵۸۸)۔

www.javedahmadghamidi.com www.almawrid.org

حضرت اسماء مسجد حرام آئیں تو وہاں موجود حضرت عبداللہ بن عمر نے صبر کی تلقین کرتے ہوئے کہا: ان مادی اجسام کی کوئی حیثیت نہیں، ارواح تو اللہ کے ہاں ہیں۔ حضرت اسماء نے کہا: میں صبر کیوں نہ کروں، یحییٰ بن زکریا کو دیکھو، اللہ کے نبی تھے جن کا سر کاٹ کر بنی اسرائیل کی ایک فاحشہ عورت کو پیش کر دیا گیا تھا۔

وہ اپنے بیٹے کو نصیحت کرتیں: بچے، اعلیٰ اخلاق کے ساتھ عمدہ زندگی گزارو، عزت و شرف حاصل کر کے مرو۔ لوگ تمھیں قید نہ کرنے پائیں۔

حضرت اسماء خوابوں کی تعبیر بتایا کرتی تھیں، یہ علم انھوں نے اپنے والد سیدنا ابوبکر سے سیکھا تھا۔ ان سے حضرت سعید بن مسیّب نے حاصل کیا اور درجۂ کمال کو پہنچے۔

حضرت اسماء دراز قد اور لحیم شحیم تھیں۔ آخری عمر میں ان کی بینائی زائل ہو چکی تھی، تاہم دانت صحیح سلامت اور حواس قائم تھے۔ طبرانی کی روایت کے مطابق ان کی نظر بھی آخر تک صحیح رہی۔ سر میں اکثر درد رہتا، سر پر ہاتھ لگا کر کہتی تھیں: یہ میرے ایک گناہ کی پاداش ہے۔ جو اللہ نے بخش دیے ہیں، کہیں زیادہ ہیں۔ حضرت اسماء عام طور پر عصفور بوٹی سے خوب رنگے ہوئے زرد کپڑے پہنتی تھیں۔ ان کی پوتی فاطمہ بنت منذر کہتی ہیں: میں نے آخری

وقت تک ان کو ایسے لباس ہی میں ملبوس دیکھا ہے۔ حالت احرام میں بھی یہی لباس ہوتا، تاہم تب زعفران کی خوشبو نہ لگاتیں۔ افلاس وتنگ دستی کے بعد اللہ نے کشادگی دی تو حضرت اسماء نے اعزہ واقربا اور حاجت مندوں پر بے دریغ خرچ کیا۔ سیدہ عائشہ کے ترکے سے حاصل ہونے والا جنگل ایک لاکھ درہم میں حضرت معاویہ کو فروخت کیا اور تمام رقم قاسم بن محمد اور ابن ابی عتیق کو دے دی (بخاری، کتاب الھبہ: باب ۲۲)۔ سیدہ عائشہ بھی بہت سخی تھیں، تاہم وہ پہلے کچھ رقم پس انداز کرتیں پھر دیتی دلاتیں، ان کے برعکس حضرت اسماء جو ہوتا دے دیتیں اور اگلے دن کے لیے کچھ بھی نہ بچاتیں۔

پابندئ شریعت اور تقویٰ کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مرتبہ ان کی والدہ کشمش، گھی اور چمڑے کو رنگنے والے درخت قرظ کے پتوں کے تحائف لے کر مدینہ آئیں تو انھیں قبول نہ کیا، والدہ کو گھر میں نہ بٹھایا اور حضرت عائشہ کو پیغام بھیجا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر بتاؤ۔ آپ نے فرمایا: ان کو عزت سے بٹھاؤ اور تحفے قبول کر لو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ. (الممتحنہ ۶۰: ۸)

''اللہ تمھیں ان لوگوں سے احسان اور انصاف کا سلوک کرنے سے منع نہیں کرتا، جنھوں نے تم سے قتال نہیں کیا اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔''

دوسری روایت کے الفاظ اس طرح ہیں، حضرت اسماء نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میری ماں (قتیلہ) محبت سے مجھے ملنے آئی ہے، عہد قریش سے مشرکہ ہے، کیا میں اس کی خدمت کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: ہاں، اس سے صلۂ رحمی کرو (بخاری، رقم ۲۶۲۰، ۵۹۷۸)۔ حضرت اسماء کے بیٹے عروہ روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں گھر آیا تو والدہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ بلند آواز میں تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچیں: 'فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ' ''تب اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں گرم لو کے عذاب سے بچا لیا'' (الطور ۵۲: ۲۷)، تو استعاذہ کرنا (اعوذ باللہ پڑھنا) شروع کر دیا۔ کافی دیر گزر گئی تو میں بازار چلا گیا، لوٹا تو بھی وہ استعاذہ میں مصروف تھیں۔ حضرت اسماء پر کوئی بیماری آتی تو تمام غلاموں کو آزاد کر دیتیں۔ اپنی بیٹیوں اور اہل خانہ کو تلقین کرتیں، انفاق کرو اور صدقہ دو۔ مال کے زائد از ضرورت ہونے کا انتظار نہ کرتے رہو۔ اگر تم بچت کی طرف دیکھتے رہے تو وہ کبھی ہاتھ نہ آئے گی اور اگر صدقہ کر دیا تو خرچ کیا ہوا محسوس بھی نہ ہوگا۔ وفات سے پہلے حضرت اسماء بنت ابوبکر نے وصیت کی کہ میرے کپڑوں کو عود خوشبو کی دھونی دینا، مجھے خوشبو لگا دینا، لیکن میرے کفن پر مشک، کافور نہ بکھیرنا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حضرت اسماء کے بیٹے منذر بن زبیر عراق سے آئے تو اپنی والدہ کو مرو شہر کے بنے ہوئے باریک عمدہ کپڑوں کا ایک جوڑا بھیجا۔ انھوں نے اسے چھوکر دیکھا اور کہا: اس کے کپڑے واپس کر دو۔ منذر پر یہ گراں گزرا، کہا: اماں جان، ان کپڑوں سے بدن دکھائی نہیں دیتا۔ حضرت اسماء نے کہا: دکھائی نہیں دیتا، پتا تو ضرور چلتا ہے۔ تب منذر نے دوسری طرح کے مروی وقوہی کپڑے خرید کر بھیجے تو حضرت اسماء نے لے لیے اور کہا: ایسے کپڑے میں پہن لیتی ہوں۔

حضرت اسماء بنت ابوبکر سے متعدد احادیث مروی ہیں جو صحیحین اور سنن میں موجود ہیں۔ ان کی مسند اٹھاون احادیث پر مشتمل ہے۔ تیرہ احادیث ہیں جن پر بخاری و مسلم متفق ہیں، ان کے علاوہ صرف بخاری میں پانچ اور مسلم میں چار حدیثیں موجود ہیں۔ حضرت اسماء بنت ابوبکر سے حدیث روایت کرنے والوں میں شامل ہیں ان کے بیٹے عبداللہ بن زبیر، عروہ بن زبیر، ان کے پوتے عباد بن عبداللہ بن زبیر، عباد بن حمزہ بن عبداللہ، عبداللہ بن عروہ، ابوبکر بن عبداللہ بن زبیر، عامر بن عبداللہ بن زبیر، عبداللہ بن عباس، ابوواقد لیثی، صفیہ بنت شیبہ، عبداللہ بن ابی مُلیکہ، مطلب بن عبداللہ بن حنطب، محمد بن منکدر، فاطمہ بنت منذر بن زبیر رضی اللہ عنہم، حضرت اسماء کے آزاد کردہ عبداللہ بن کیسان، مسلم قری، ابونوفل معاویہ بن ابوعقرب اور وہب بن کیسان۔

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، الجامع المسند الصحیح (بخاری، شرکۃ دار الارقم)، المسند الصحیح المختصر من السنن (مسلم، شرکۃ دار الارقم)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، حلیۃ الاولیاء و طبقات الاصفیاء (ابونُعیم اصفہانی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، تہذیب الکمال فی اسماء الرجال (مزی)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، سیر اعلام النبلاء (ذہبی)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، تہذیب التہذیب (ابن حجر)، اردو دائرۂ معارف اسلامیہ (مقالہ: سید نذیر نیازی)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پروفیسر خورشید عالم

''نسائیات''

[ڈاکٹر محمد شکیل اوج کی کتاب ''نسائیات'' پر تبصرہ اور تعارف]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

گئے وقتوں میں خواتین کے مسائل کو ''احکام النساء'' کا نام دیا جاتا تھا۔ محترم ڈاکٹر محمد شکیل اوج صاحب نے اس کے لیے نئی خوب صورت اصطلاح ''نسائیات'' متعارف کرائی ہے۔ نسائیات خواتین کے بارے میں چند فکری و نظری مضامین کا مجموعہ ہے جو سہ ماہی ''تفسیر'' کراچی اور ماہنامہ ''معارف'' اعظم گڑھ میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر محمد شکیل اوج کا نام علوم تفسیر قرآن میں بہت بڑا نام ہے۔ وہ بات کی تہ میں اتر کر اسے سمجھنے اور اس کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی کتاب ''نسائیات'' میں انھوں نے خواتین کے عصری معاشرتی مسائل پر گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب قرآن حکیم سے براہ راست استدلال کرتے ہیں۔ موضوع کے بارے میں سب آیات مبارکہ کو یکجا کر کے ان کے مفہوم و معانی کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قرآن کی داخلی شہادت پر انحصار کرنا ہی بہترین منہج ہے۔ جو نقطۂ نظر وہ پیش کرتے ہیں، اس کی تائید میں وہ مفسرین، محدثین، فقہا اور اہل لغت کی آرا کی تائید سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس نتیجۂ فکر میں وہ تنہا نہیں۔ موضوع کے بارے میں لمبی چوڑی تمہید اور فلسفیانہ موشگافیوں کے بجائے براہ راست قرآنی آیات کو پیش کر کے موضوع کو آسان اور قابل فہم بنا دیتے ہیں۔ ذہن میں کوئی الجھن نہیں رہتی اور یہی کلام الٰہی کی خوبی ہے۔ بعض موضوعات ان کی اولیات میں شمار ہوتے ہیں، کیونکہ میرے علم کی حد تک ان پر پہلے بحث نہیں کی گئی ہے۔

کتاب میں شامل کل مقالات کی تعداد بیس ہے۔ ان میں سے میں نے ''حلالہ مروجہ اور قرآنی حلالہ''، ''حق حضانت'' (guardianship)، ''جہیز ایک معاشرتی بوجھ'' اور ''اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات'' پر کوئی تبصرہ نہیں کیا،

کیونکہ ان موضوعات کو اصل مفہوم کے مطابق آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اور حضانت کے بارے میں عورت کے حق کو سب عدالتیں تسلیم کرتی ہیں اور اس کے مطابق فیصلے کرتی ہیں، اس لیے یہ موضوعات بحث کے محتاج نہیں رہے۔

سب سے پہلا مضمون ''نکاح وطلاق میں زوجین کے حقوق کا تعین'' ہے۔ طلاق اور نکاح کے بارے میں قرآن حکیم کی سب آیات کو یکجا کر کے ان کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ مختلف کتب حدیث، طحاوی کی ''شرح معانی الآثار'' اور عربی لغات کو اپنی رائے کی تائید میں پیش کیا گیا ہے۔ 'عُقْدَۃُ النِّکَاحِ' سے مراد مصنف کے نزدیک نکاح کی گرہ باندھنا نہیں، بلکہ کھولنا ہے، کیونکہ نکاح مرد وعورت کے باہمی ایجاب وقبول سے، اور دو طرفہ معاملہ ہے، جبکہ اس گرہ کو کھولنا یک طرفہ معاملہ ہے اور صرف مرد کے اختیار اور مرضی پر اس کا انحصار ہے۔ محترم مصنف نے 'اَوْ یَعْفُوَا الَّذِیْ بِیَدِہٖ عُقْدَۃُ النِّکَاحِ' (البقرہ ۲: ۲۳۷) میں لفظ 'عفو' پر بہت عمدہ لغوی بحث کی ہے اور اس کے معنی اپنا حق چھوڑنا اور زیادہ دینا بیان کیے ہیں۔ اور جو لوگ اس آیت سے شوہر کے بجائے ولی (سرپرست) لیتے ہیں، ان کی پرزور تردید کی ہے، کیونکہ اس طرح ولی کو مہر کے قبضہ وتصرف کا حق دار بھی ماننا جائے گا، جبکہ مہر صرف عورت کا حق ہے، اور ایسا سمجھنا شریعت میں اضافہ کے مترادف ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

محترم ڈاکٹر صاحب اپنی کتاب کے صفحہ ۳۰ پر فرماتے ہیں:

> ''واضح رہے کہ عقد نکاح عام معاہدوں کی طرح کوئی معاہدہ نہیں بلکہ یہ عام معاہدوں سے مختلف معاہدہ ہے جس میں مرد کی حیثیت شریک غالب کی اور عورت کی حیثیت شریک مغلوب کی ہوتی ہے اور اس کی سند 'وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ' (البقرۃ: ۲۲۸) کے اندر موجود ہے۔''

فاضل مصنف کی یہ رائے محل نظر ہے۔ یہ بات تو درست ہے کہ یہ عام معاہدوں سے مختلف ہے، کیونکہ گھریلو نظام کوئی کاروباری یا سرکاری نظام نہیں جن میں غالب ومغلوب اور حاکم ومحکوم کا تصور ہوتا ہے اور ڈسپلن قائم کرنے کے لیے ایک داروغہ ڈنڈا لیے کھڑا رہتا ہے۔ قرآن حکیم گھر گرہستی میں محبت، رحمت اور سکون کی فضا قائم کرنا چاہتا ہے جو 'عَنْ تَرَاضٍ مِّنْھُمَا وَتَشَاوُرٍ' (البقرہ ۲: ۲۳۳)، یعنی دونوں کی باہمی رضامندی اور مشورے سے قائم ہوتی ہے، نہ کہ غالب ومغلوب کی حیثیت سے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لیے قرآن نے بیوی کے لیے 'زوج' اور 'صاحبہ' کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا اطلاق غالب ومغلوب پر کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔

اب آتے ہیں فاضل مصنف کی سند کی طرف جس کا حوالہ انھوں نے متعدد مقامات پر دیا ہے: 'وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَۃٌ' طلاق کے مضمون میں عورتوں کے حقوق کی طرف توجہ دلانا اس غرض سے ہے کہ چونکہ طلاق دینا مرد کا اختیار ہے، اس لیے عورتوں کے کوئی حقوق ہی نہیں، بلکہ جس طرح مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں، اسی طرح عورتوں کے

حقوق مردوں پر ہیں۔یعنی بہ لحاظ حقوق وفرائض ان میں مکمل مساوات ہے۔اس بات سے مرد کی مطلق فضیلت کا خود بخود ابطال ہو جاتا ہے۔آیت میں مرد اور عورت کی فضیلت کا موضوع مطلقاً زیر بحث نہیں۔اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں پر 'دَرَجہ' کے کیا معنی ہیں؟امام طبری نے اپنی تفسیر (۲/۴۵۴) 'دَرَجہ' کی تفسیر کرتے ہوئے جو بات کہی ہے،وہ قول فیصل کا درجہ رکھتی ہے۔'دَرَجہ' کے بارے میں مجاہد،قتادہ،زید بن اسلم اور ابن زید کے اقوال نقل کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں:

''تمام مذکورہ اقوال میں عکرمہ کی روایت سے نقل کردہ ابن عباس کا قول سب سے زیادہ مناسب اور بہتر ہے۔وہ قول یہ ہے:

لا احب ان استنظف جمیع حق علیھا لان اللّٰہ تعالٰی ذکرہ یقول للرجال علیھن درجة. ''میں نہیں چاہتا کہ عورت سے اپنا سارا حق لوں،کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مردوں کو ان پر ایک درجہ ہے''۔''

اس سے مراد یہ ہے کہ مرد عورت پر اپنے حق کو یا اس کے کچھ حصے کو معاف کر دے،چشم پوشی سے کام لے اور اس کے تمام حقوق کو پورا کرے،کیونکہ اللہ نے 'وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ' کے فوراً بعد فرمایا:'وَلِلرِّجَالِ عَلَیْھِنَّ دَرَجَةٌ'۔اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مرد نہ تو تین طہر میں رجوع کرنے کے بعد اور نہ ہی دوسرے حقوق میں عورت کو تکلیف اور ضرر پہنچائے اور نہ ہی عورت کو چاہیے کہ وہ اپنے رحم میں بچے کو چھپا کر اور نہ ہی دوسرے حقوق میں مرد کو تکلیف اور ضرر پہنچائے۔اس کے بعد مردوں کو اس بات پر آمادہ کیا ہے کہ اگر عورت سے کسی قسم کی کوتاہی ہو جائے تو وہ وسعت قلب سے کام لے اور یہی مطلب ہے ابن عباس کے مذکورہ قول کا۔

امام قرطبی نے اپنی تفسیر (۳/۱۲۵) میں کہا ہے کہ ابن عباس کا قول اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ عورت سے حسن سلوک کرنا چاہیے۔نیز مال اور اخلاق میں وسعت قلبی سے کام لینا چاہیے۔''البحر المحیط'' (۲/۲۰۰) نے بھی یہی بات بیان کی ہے۔

ابن العربی نے ''احکام القرآن'' (۱/۱۸۸) میں ذرا کھول کر بیان کیا ہے کہ ''دَرَجہ' کے بارے میں علما کی رائے میں اختلاف ہے۔کسی نے کہا ہے کہ اس سے مراد جہاد ہے۔کسی نے کہا کہ اس سے مراد میراث ہے۔کسی نے کہا کہ اس سے مراد ڈاڑھی ہے ...لیکن آیۂ مبارکہ میں مطلق درجہ کا کوئی ذکر نہیں جس کی وجہ سے ہم عورتوں پر مردوں کی فضیلتیں گنوانے بیٹھ جائیں۔''

سید قطب اپنی تفسیر ''فی ظلال القرآن'' (۱/۲۴۶) میں فرماتے ہیں کہ میری رائے یہ ہے کہ یہ درجہ مقید ہے۔آیت کے سباق کی رو سے اس سے مراد عدت کے دوران رجوع کا حق ہے۔

ان جلیل القدر مفسرین کی رائے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ درجہ مقید ہے مطلق نہیں۔یہ درجہ ذمہ داری کا ہے،فضیلت

کانہیں۔اس لیے یہ قرآن میں بیان کردہ انسانی مساوات کے اصول پر قطعی اثر انداز نہیں ہوتا۔عورت اور مرد کے حقوق میں مساوات معاشرتی زندگی میں بہت بڑا انقلاب ہے۔

کم سنی کی شادی

دوسرا مقالہ کم سنی کی شادی کے بارے میں ہے۔مصنف نے بڑے مدلل طریقے سے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ نکاح دو ایسے شخصوں کے درمیان معاہدہ ہے جو عاقل و بالغ ہوں اور بہ رضا و رغبت ایک دوسرے کو قبول کریں۔ یہ معاہدہ دو غیر عاقل اور غیر بالغ افراد کے درمیان طے نہیں پا سکتا۔فاضل مصنف نے قرآن حکیم کی آیات البقرہ۲:۳، ۴، ۱۹، ۲۲۲-۲۲۳، ۲۲۸ سے ثابت کیا ہے کہ قرآن کی رو سے نکاح کا تعلق بلوغ سے ہے۔ان آیات میں بلوغ کی جگہ لفظ 'نکاح' کا استعمال عقل کی پختگی اور لفظ 'نساء' (بالغ عورتیں) جبر و اکراہ کی ممانعت (نابالغ لڑکیوں سے نکاح جبر کے مترادف ہے) پر دلالت کرتا ہے۔ مطلقہ عورتوں کے لیے تین حیض کا انتظار، حائضہ سے مجامعت کی ممانعت اور عورت کو کھیتی سے تشبیہ یہ سب کم سنی کی شادی کے خلاف قرآنی شواہد ہیں۔

کم سنی کی شادی کے جواز میں آیت ۶۵:۴ پیش کی جاتی ہے اور 'لَمْ یَحِضْنَ' سے استدلال کیا جاتا ہے۔فاضل مصنف نے واضح کیا ہے کہ اگر 'ما حضن' کہا جاتا تو معنی ہوتے: حیض ابھی آیا نہیں، جبکہ نفی جحد بلم سے مخالف کے دعویٰ کی نفی مقصود ہوتی ہے، یعنی حیض تو آیا ہوا ہے، مگر کسی عارضے کی وجہ سے نہیں آیا۔رہا وہ اعتراض جو نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت عائشہ سے کم سنی کی شادی پر کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں فاضل مصنف نے خصوصیت اور احکام کے نزول سے پہلے کے واقعہ کی جو توجیہ پیش کی ہے، اس میں وزن معلوم نہیں ہوتا۔ہاں جن علما نے بخاری و مسلم کی روایت پر محاکمہ کیا ہے کہ حضرت عائشہ اس وقت بالغ تھیں۔اس میں کافی وزن لگتا ہے۔اس سلسلہ میں نیاز احمد کی ''کشف الغمۃ عن عمر امّ الامۃ'' اور حبیب الرحمٰن کاندھلوی کی ''عمر عائشہ صدیقہ'' دو تحقیقی کتابیں ہیں جو پڑھنے کے لائق ہیں۔

پسند کی شادی

پسند کی شادی ایک اہم سماجی مسئلہ ہے۔ہم آئے روز اخباروں میں پڑھتے ہیں کہ لواحقین نے فریقین کو قتل کر دیا یا عدالت کے باہر ان پر قاتلانہ حملہ کر دیا اور عدالتیں اسلامی اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کا دفاع کرتی ہیں۔فاضل مصنف نے پسند کی شادی کے حق میں قرآنی آیت (النساء۴:۳) اور (النساء۴:۱۹) سے استدلال کیا ہے۔اسلام کی رو سے شادی کی غرض سے مرد عورت کو دیکھ سکتا ہے۔یہ ناممکن ہے کہ مرد کا دیکھنا یک طرفہ ہو، یہ دیکھنا دو طرفہ ہوگا کہ

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

قرآن کہتا ہے کہ ''تمھارے لیے جائز نہیں کہ عورتوں پر زبردستی قبضہ کرلو''۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ شادی میں مرد کی پسند کے ساتھ ساتھ عورت کی پسند کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ قرآن نے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اس سے بڑا خوب صورت استدلال کیا ہے کہ لباس جسم کے مطابق ہونا چاہیے جو لباس بدن کے مطابق نہ ہو، اسے پہنا نہیں جاتا۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایک روایت بیان کی ہے جس کی مدد سے حضرت علی نے اس نکاح کو جائز قرار دیا جو لڑکی کی ماں نے لڑکی کی رضامندی کے ساتھ ولی کی اجازت کے بغیر پڑھوایا۔

تعدد ازدواج

تعدد ازدواج کو فاضل مصنف نے قرآنی آیات کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ قرآن نے تعدد ازدواج کی ضرورت کے تحت اجازت دی ہے۔ مثلاً بیوی دائم المریض ہو جس میں شفایابی کی امید نہ ہو یا بیوی بانجھ ہو۔ اس میں شرط یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ عدل کیا جائے۔ لیکن فاضل مصنف نے مرد کی جنسی قوت کو بہانہ بنا کر اسے دوسری شادی کے جواز کے لیے پیش کیا ہے جو بالکل بے وزن دلیل ہے۔ اول تو سائنسی طور پر یہ مفروضہ غلط ہے کہ مرد کی جنسی طاقت عورت سے زیادہ ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے عورت بچوں کی پیدایش اور پرورش کی وجہ سے تروتازگی کھودے، مگر اس کا جنسی طاقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس دلیل کے پس پردہ مرد کو جنسی تسکین اور تفنن کا کھلا لائسنس دے دیا جاتا ہے جو قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔ وہ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری اور تیسری سے چوتھی بیوی تک محض شہوت پرستی اور تفنن طبع کی بنیاد پر منتقل ہوتا رہے گا۔ تو نہیں تو اور سہی۔ کیا اسے ہم شادی کہیں گے یا لذت پرستی، بچوں اور بیوی کی خاطر اپنے آپ کو قابو میں رکھنا مومنوں کا شیوہ ہے، لذت پرستی کی خاطر جگہ جگہ منہ مارنا حیوانوں کی خصلت ہے۔ جنسی رغبت پر قابو پانے کے لیے روزے کا مشورہ تو شارع علیہ السلام نے دیا ہے۔

مسیار میرج

اس شادی میں مرد بیوی کی معاشی ذمہ داریوں سے دور رہتا ہے۔ اور یہ بات بوقت نکاح مرد کے ساتھ طے کرلی جاتی ہے۔ فاضل مصنف کی رائے میں اگر انعقاد نکاح کی شروط عقل، بلوغ اور باہمی رضامندی مسیار میں پائی جاتی ہوں تو یہ نکاح صحیح قرار پائے گا، کیونکہ عورت کو اختیار ہے کہ وہ ادائیگی سے پہلے حق مہر کو جزوی طور پر یا کلیتاً معاف کرے۔ اگر کوئی عورت اپنی ملازمت اور مالی حیثیت کی وجہ سے شوہر کو نان ونفقہ سے آزاد کردے تو اس سے نفس نکاح میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔ خاص صورت حال میں ایسے نکاح مفید ہیں اور زنا کو روکنے کا ذریعہ ہیں۔

مسیار کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مال دار شخص کسی غریب عورت سے نکاح کرتا ہے۔ مہر میں اسے گراں قدر رقم اور کچھ جائیداد بھی دیتا ہے، پھر کچھ عرصے بعد اسے طلاق دے دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسیار میں طلاق بطور شرط نہیں ہوتی۔ فاضل مصنف کی رائے میں اگر مسیار میریج میں ثبوت نسب اور ایک دوسرے کی زوجیت میں مرنے کی صورت میں وراثت سے انکار نہ پایا جاتا ہو تو وہ واضح طور پر جائز ہے۔

زوج اور سوت —— دو متقابل اصطلاحیں

فاضل مصنف کو یہ باب تعدد ازدواج میں شامل کرنا چاہیے تھا اور زیادہ بہتر یہ تھا کہ وہ اس موضوع پر بات نہ کرتے۔ فاضل مصنف کا خیال کہ سوت اور سوتاپا کا تصور صرف اردو زبان میں پایا جاتا ہے اور اس کا مقصد تعدد ازدواج کے تصور کو ظالمانہ ثابت کرنا ہے، درست نہیں۔ عربی زبان میں بھی سوت کے لیے 'ضرۃ' کا لفظ ہے۔ ''مقاییس اللغہ'' میں 'تزوّج المرأة علی ضرّة ای نکحت الفلانة علی ضرّة ای امراة کانت قبلها کانها تضرّ الاخری کما تضرها تلك'، یعنی فلاں عورت نے پہلے سے موجود بیوی کے ہوتے ہوئے شادی کی، گویا وہ دونوں ایک دوسرے کو ضرر پہنچانے والی ہیں۔ لفظ 'ضریر' کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا اکثر استعمال غیرت کے معنوں میں ہوتا ہے۔ محاورے میں کہا جاتا ہے: 'ما اشد ضریره علیها' (وہ اس پر کتنی زیادہ غیرت کھاتی ہے)۔ عربی محاورہ میں کہا جاتا ہے: 'بینهم داء الضرائر' (ان کے درمیان سوکنوں کا حسد ہے)۔

سوتاپا ایک فطری جذبہ ہے جس کا اظہار اردو کے علاوہ ہر زبان میں ہوتا ہے۔ جس عورت پر سوت کو لایا جائے، وہ بھی انسان ہوتی ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہے۔ اس کے جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ وہ آہ بھی نہ کرے، اپنے لبوں کو سی لے اور اپنے لہو کے گھونٹ پیتی رہے؟ خاص طور پر اگر مرد بغیر کسی معقول وجہ کے صرف شہوت پرستی کے لیے شادی کرے تو یہ فطری جذبہ شدید تر ہو جاتا ہے۔ اس جذبہ کو صرف شوہر کا پیار کنٹرول کر سکتا ہے۔ اس کے لیے اسے پہلے سے بڑھ کر اپنی بیوی کی طرف توجہ دینی ہوگی۔ محترم ڈاکٹر صاحب تعدد ازدواج کے داعی ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مرد جو چاہے کرے عورت دم نہ مارے۔ دوسری بات کہ زوج اور سوت دو متقابل اصطلاحیں ہیں، درست نہیں۔ بیوی کو شوہر کی نسبت سے زوج کہا گیا ہے نہ کہ دوسری بیوی کی نسبت سے۔ دوسری پہلی بیوی کی سوت ہے نہ کہ زوج۔ میرا اپنا خیال ہے کہ شوہر پہلی بیوی کو قرآنی اصطلاح میں اگر زوج سمجھتا ہو تو بغیر وجہ کے دوسری بیوی کی طرف رخ بھی نہ کرے۔

ڈاکٹر صاحب نے قرآن کی جس آیت سے استدلال کیا ہے، وہ تو ڈاکٹر صاحب کے تصور کی نفی کرتی ہے۔ آیت

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یوں ہے: 'اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّکَانَ زَوْجٍ '، ''اگر تم ایک زوج کو چھوڑ کر دوسری زوج کرو'' (النساء۴: ۲۰) آیت میں مخاطب شوہر ہیں اور ان کی نسبت سے دوسری بیوی کو زوج کہا گیا۔ آیت یہ بتاتی ہے کہ دوسری بیوی سے بلاوجہ شادی کے لیے نارمل حالات میں پہلی کو چھوڑنا پڑے گا۔ یہاں پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری بیوی کا ذکر نہیں ہے۔ اسی سوتاپے پر قابو پانے کے لیے قرآن نے عدل کی شرط رکھی ہے اور ساتھ یہ بھی کہہ دیا ہے کہ 'وَلَنْ تَسْتَطِیْعُوْا اَنْ تَعْدِلُوْا '، ''اور تم ہرگز عدل نہ کر سکو گے'' (النساء۴: ۱۲۹)۔ تعدد ازدواج کے داعی یہ کہتے ہیں کہ دل کے معاملات میں عدل نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ ہر آدمی کے بس میں نہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا سوتاپا عورت کے بس میں ہوتا ہے؟

امہات المومنین کے درمیان بھی سوتاپے کا جذبہ موجود تھا۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُم سلمہ کا ہاتھ مانگنے گئے تو انھوں نے دو عذر پیش کیے: ایک تو میرے بچے چھوٹے ہیں۔ دوسرے میں غیرت بہت کھاتی ہوں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو یہودیہ کی بیٹی کیوں کہتی تھیں؟

محصنین اہل کتاب سے مسلم عورتوں کا نکاح

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یہ ایک حساس موضوع ہے۔ فضیلۃ الشیخ حسن ترابی نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے نقطۂ نظر کو ٹھوس دلائل سے ثابت کیا ہے، جو مسلمان یورپ یا امریکہ میں بس گئے ہیں، یہ ان کا بڑا مسئلہ ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی روایات تو اس کی اجازت نہیں دیتیں، لیکن فاضل مصنف نے قرآن سے استشہاد کیا ہے۔ ان کی سوچ میں خاصا وزن محسوس ہوتا ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے قرآن میں موجود چار قرینوں سے دلیل پکڑی ہے:

پہلا قرینہ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۲۱ ہے جس میں مسلم مرد کا مشرک عورت سے اور مسلم عورت کا مشرک مرد سے نکاح ممنوع ہے، جبکہ اللہ نے اہل کتاب کی عورتوں سے مسلمان مردوں کا نکاح جائز قرار دیا تو مسلمان عورتوں کا نکاح اہل کتاب کے مردوں سے ناجائز قرار نہیں دیا۔ اگر مسلمان عورت کا نکاح اہل کتاب سے ناجائز ہوتا تو اس مقام پر اس کی وضاحت کر دی جاتی۔

دوسرا قرینہ طعام و نکاح کی حلت سے قبل قرآن حکیم نے ایک اصول بیان کر دیا ہے، یعنی 'اَلْیَوْمَ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ '، ''آج کے دن ہر قسم کے طیبات کو تمھارے لیے حلال کیا جاتا ہے'' (المائدہ۵: ۵)۔ اس اصولی موقف کے بعد اہل کتاب کے طعام و نکاح کو حلال کیا گیا ہے۔ طعام کی حلت دوطرفہ اور نکاح کی حلت یک طرفہ ہے، مگر یک طرفہ نوعیت کی حلت بھی دوطرفہ ہے۔ اہل کتاب کی محصنات اپنے حسن کی وجہ سے طیبات میں شمار ہوتی ہیں۔ اگر یہی خصوصیت اہل کتاب کے محصنین میں پائی جائے تو انھیں طیبین کے زمرے سے کیسے نکالا جا سکتا ہے؟

طیبات کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے فاضل مصنف نے سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۲۶ کا حوالہ دیا ہے کہ ناپارسا عورتیں ناپارساؤں کے لیے ہیں اور ناپارسا مرد ناپارسا عورتوں کے لیے ہیں۔

تیسرا قرینہ یہ ہے کہ 'وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ' سے پہلے 'وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ' آیا ہے۔ آیت میں مومنات کے نکاح کا بیان ہے، مومنین سے نکاح کا بیان نہیں۔ مگر یہ صورت دوطرفہ نکاح کی متقاضی ہے، بالکل اسی طرح صرف اہل کتاب کی محصنات کا بیان ہے اور یہ صورت بھی دوطرفہ نکاح کی متقاضی ہے۔

چوتھا قرینہ یہ ہے کہ قرآن حکیم میں کہیں بھی غیر شادی شدہ مسلمان عورتوں کو مردوں سے نکاح کا حکم نہیں دیا گیا۔ جب ان کو ہم مذہب مردوں سے نکاح کا حکم نہیں دیا تو انھیں اہل کتاب مردوں سے نکاح کرنے کا حکم کیسے دیا جا سکتا ہے؟

بچہ کا باپ سے اثر پذیر ہونے کا جواب فاضل مصنف نے یہ دیا ہے کہ اہل کتاب باپ بچے کے لیے اپنے اثر و نفوذ میں مسلمان ماں سے بڑھ کر کردار ادا نہیں کر سکتا، کیونکہ بچے کی پہلی درس گاہ ماں کی گود ہوتی ہے۔ اس طرح فاضل مصنف نے پہلے باب کے صفحہ ۳۰ پر اپنے بیان کی نفی کر دی ہے کہ عقد نکاح کے معاہدے میں مرد کی حیثیت غالب کی اور عورت کی حیثیت مغلوب کی ہوتی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تفویض طلاق

میری رائے میں مصنف نے خواہ مخواہ اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ''اور اسے خدا کی شریعت میں تبدیلی کا جرم قرار دیا ہے''۔ حق تفویض ایک مسلمہ امر ہے۔ عصر حاضر میں بھی گورنمنٹ کے مالی اداروں اور بینکوں میں اس حق کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ قانونی معاملات میں power of attorny کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر مالک اپنا اختیار کسی دوسرے کے سپرد کرتا ہے تو اسے جائز سمجھا جاتا ہے۔ اس بنا پر فقہ کی تمام کتابوں میں تفویض طلاق کے عنوان سے یہ حق بیویوں کے بارے میں تسلیم کیا گیا ہے اور موجودہ نکاح کے فارم میں اس کا باقاعدہ اندراج ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر شوہر اپنا حق بیوی کو دے دیتا ہے تو میں اور آپ روکنے والے کون ہوتے ہیں؟

سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۲۸ میں بیویوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ شوہر کے ساتھ رہنے یا اس سے جدا ہونے کے درمیان کسی ایک چیز کا خود فیصلہ کر لیں۔ مولانا مودودی نے بجا کہا ہے کہ اسلامی فقہ میں تخییر دراصل تفویض کی حیثیت رکھتی ہے۔ فاضل مصنف نے اس آیت کی جو تاویل کی ہے، وہ بے وزن ہے۔ فاضل مصنف یہ چاہتے ہیں کہ مرد جو چاہے کرتا رہے اور بے چاری عورت صبر سے اس کے غلبے کو تسلیم کر لے۔

لونڈیوں سے تمتع یا نکاح

یہ مقالہ محترم ڈاکٹر صاحب نے انتہائی خوب صورت اور مدلل الفاظ میں لکھا ہے۔اور میں زیرنظر کتاب میں اسے ان کا شاہ کار تصور کرتا ہوں۔سب سے پہلے قرآن کے ان مقامات کا تعین کیا گیا ہے جن میں 'مَا مَلَکَتُ اَیۡمَانُکُمۡ' کی ترکیب وارد ہوئی۔ پھر بتایا گیا ہے کہ جنگی قیدیوں کو غلام، جانور اور لونڈی بنانا قرآن حکیم کے خلاف ہے، کیونکہ قرآن حکیم میں سورۂ محمد (۴۷) کی آیت ۴ میں ارشاد ہے: 'فَاِمَّا مَنًّا بَعۡدُ وَاِمَّا فِدَآءً' (پھر انھیں احسان کر کے چھوڑ دیا جائے یا فدیہ لے کر چھوڑ دو)۔صرف یہ دو آپشن ہیں، کوئی تیسرا آپشن نہیں۔تو پھر جنگ میں ہاتھ لگی قیدی عورتیں اس حکم سے کیسے مستثنیٰ ہوسکتی ہیں؟

دوسری دلیل یہ ہے کہ 'اَوۡ مَا مَلَکَتۡ' میں ماضی کا صیغہ استعمال ہوا ہے اور ترجمہ کرنے والے اس کا ترجمہ مضارع میں کرتے ہیں تاکہ لونڈیوں کا سلسلہ جاری رہے۔فاضل مصنف نے آٹھ آیات سے استدلال کیا ہے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنا چاہیے، نہ کہ تمتع۔ان آیات کی تشریح میں فاضل مصنف نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔

'ملك یمین' سے مراد وہ عورتیں ہیں جنھیں قبل از اسلام غلامی وراثت میں ملی تھی، اسی لیے قرآن نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا ہے۔قرآن نے 'مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ' کے اسلوب سے موروثی غلاموں کو ختم کیا ہے، نہ کہ اسے جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے۔فاضل مصنف نے بالکل درست کہا ہے کہ زن وشو کا تعلق ملکیت کی بنیاد پر درست نہیں ۔پھر یہ مسئلہ باندی کے لیے کیسے خاص ہوگیا۔اس اصول کے تحت مالکہ کا اپنے غلام سے ہم بستر ہونا ناجائز کیوں؟ مباشرت کی علت محض ملکیت نہیں ہوسکتی، کیونکہ مالکہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کیا گیا۔

فاضل مصنف نے اس بات کی سختی سے تردید کی ہے کہ آپ نے ماریہ قبطیہ سے تمتع کیا۔ماریہ اسلام قبول کرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عقد میں آئیں۔جب آپ نے ریحانہ، بریرہ اور صفیہ کو آزاد کر کے نکاح کیا تو آپ ماریہ سے تمتع کیسے کرتے؟ یہ آپ کی ذات بابرکات پر ایک اتہام ہے۔فاضل مصنف نے دوسری دلیل کے تحت قرآن کی سورۂ نساء (۴) کی آیت ۲۴ کی بڑی خوب صورت تفسیر کی ہے: 'وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ' (اور شادی شدہ عورتیں تم پر حرام ہیں، سوائے اس صورت کے کہ وہ تمھاری ملک میں آجائیں)۔یہاں 'ملك یمین' سے مراد ملک نکاح ہے، نہ کہ وہ عورتیں جو جنگ میں قید ہو کر 'ملك یمین' ہوجائیں، یعنی پہلے خاوند سے جدائی کے بعد دل کی رضامندی سے اور گواہوں کی موجودگی میں نکاح کر کے وہ تمھارے قبضے میں آجائیں۔اس سلسلہ میں مصنف نے ملک کے بارے میں اردو کے غلط ترجموں کی نشان دہی کی ہے اور مولانا آزاد

کے ترجمہ کو سراہا ہے۔

نصاب میں شہادت اور عورتوں کی گواہی

فاضل مصنف کا قول ہے کہ پورے قرآن میں صرف سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۸۲ میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کے برابر مانا گیا ہے۔ باقی مقامات میں اس طرح کی کسی قید اور شرط کے بغیر گواہوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر تسلیم کرنے والے چار عورتوں کی گواہی کو دو مردوں کے برابر تسلیم نہیں کرتے۔ فاضل مصنف نے مولانا وحید الدین خان کے حوالے سے جس تحقیق کا ذکر کیا ہے کہ مردوں کے اندر ریاضیات کی معلومات کو یاد رکھنے کی زیادہ صلاحیت ہے۔ یہ علمی طور پر درست نہیں۔ اللہ نے جب انسانی ڈھانچہ بنایا تو مرد کی طرح عورت کے ڈھانچے میں بھی اپنی روح پھونکی۔ دونوں کی فطری صلاحیتیں برابر ہیں۔ یہ فرق مردانگی پرستوں کے ذہن کی ایجاد ہے یا ماحول کے اثرات کا نتیجہ۔ میری دو پوتیوں نے پاکستان اور لندن کے اداروں سے اکاؤنٹینسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے اور اب وہ لاہور کے معروف ادارے میں تدریس کے فرائض انجام دے رہی ہیں۔ اس ادارے میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے بڑھ کر ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس معاشرے میں قرآن کا نزول ہوا، اس میں خواتین کے لیے تجارتی اور لین دین کے معاملات میں ماحول سازگار نہ تھا۔ تجربے کی اس کمی کی بنیاد پر دو عورتوں کی گواہی کو ضروری سمجھا گیا۔ پھر جہاں تک شہادت کا معاملہ ہے تو پاکستان میں اس دور میں بھی ایک عورت کا کورٹ کچہری میں جا کر گواہی دینا مشکل کام ہے، اس لیے اس کے ساتھ دوسری عورت کو ضروری سمجھا گیا۔ گواہی تو ایک عورت دے گی، دوسری عورت صرف گھبراہٹ اور بھول چوک کی صورت میں اس کی مدد کرے گی۔

باقی مقامات پر شہادت کے لیے چونکہ مذکر کا صیغہ استعمال ہوا ہے، اس لیے اسلوب تغلیب کو نظر انداز کر کے سمجھ لیا گیا ہے کہ اس میں خواتین شامل نہیں ہیں، حالاں کہ قرآن حکیم میں جہاں بھی شہادت اور گواہیوں کا ذکر ملتا ہے، وہ بغیر کسی صنفی اختلاف کے مرد اور عورت ہر دو کے بیان پر مشتمل ہے۔ یہ بات محترم ڈاکٹر صاحب نے بالکل درست کہی ہے۔

کھلے چہرے کے ساتھ عورتوں کا گھر سے باہر کا پردہ

فاضل مصنف نے سورۂ نور (۲۴) کی آیت ۳۰ اور ۳۱ سے استدلال کیا ہے: 'قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ' (مومن مردوں سے کہہ دیں کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کرو)۔ یہ حکم اس وقت تک قابل فہم ہوسکتا ہے جب

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

عورتوں کے چہرے کھلے ہوں۔ اور دوسرے ’وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوْبِھِنَّ‘ (اور عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں میں ڈال لیں)۔ یہاں ’علی وجوھھن‘ اپنے چہروں پر ڈال لیں نہیں کہا گیا۔ اس کے علاوہ فاضل مصنف نے چہروں کے ذریعے سے تعارف ہونے کے قرآنی دلائل پیش کیے ہیں۔ اس کے لیے البقرہ (۲) کی آیت ۲۷۳، المطففین (۸۳) کی آیت ۲۴، الحج (۲۲) کی آیت ۲۷، الفتح (۴۸) کی آیت ۲۹ اور الرحمٰن (۵۵) کی آیت ۴۱ سے استدلال کیا ہے۔ ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ چہرہ انسان کی شناخت اور معرفت کا ذریعہ ہے۔

اس کے علاوہ فاضل مصنف نے حضرت سارہ، حضرت موسیٰ کی بہن اور شیخ مدین کی دولڑکیوں اور حضرت مریم کا حوالہ دے کر ثابت کیا ہے کہ پچھلی شریعتوں اور قوموں میں بھی چہرہ کھلا رکھا جاتا تھا۔ مقالہ کے آخر میں فاضل مصنف نے کہا ہے کہ گھروں میں رہنے اور باہر نہ نکلنے کے حکم کا تعلق دراصل ان کے اعمال اور کردار سے جڑا ہوا ہے، کیونکہ قرآن نے فاحشہ عورتوں کو گھروں میں مقید رکھنے کا حکم دیا ہے (النساء ۴: ۱۵)۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

نیل پالش کے ساتھ وضو

میرے خیال میں یہ کوئی اتنا اہم مسئلہ نہیں جس کے بارے میں علمی بحث کی جائے۔ یہ اسی نوعیت کا مسئلہ ہے، جیسے لاؤڈ سپیکر۔ ہمارے مذہبی رہنما پہلے اس کے حرام ہونے کا مشورہ دیتے تھے، اب اس کی جان نہیں چھوڑتے۔

فاضل مصنف نے پہلے تو احادیث سے استدلال کر کے بناوٹی ناک اور سونے کے دانت یا دانت باندھنے والی سونے کی تار پر قیاس کر کے اس کے جواز کو ثابت کیا ہے اور اس سلسلہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان پیش کیا ہے کہ عورتوں کو اپنے ناخن رنگنے چاہییں۔ اس زمانہ میں ناخنوں کو مہندی سے رنگا جاتا تھا، آج کل نیل پالش سے رنگا جاتا ہے۔ یہ حدیث سنن ابی داؤد میں مروی ہے۔

اس کے علاوہ فاضل مصنف نے قرآن کا اصول رفع حرج پیش کیا ہے کہ کیا خاتون بالخصوص دلہن محض نیل پالش کے عذر کی وجہ سے نماز سے محروم سمجھی جائے گی؟ روٹی پکانے والی کے ناخنوں میں آٹا، کاتبوں کے ناخنوں پر سیاہی، رنگریز کے ناخنوں پر رنگ اور اس طرح اگر دوسرے کام کرنے والے کے ناخن پر اگر کوئی جسم دار چیز ہو اور اس کے چھڑانے میں دقّت ہو تو نہ چھڑانے سے بھی وضو ہو جائے گا اور غسل بھی۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ہونا چاہیے تاکہ دیار غیر میں بسنے والے مسلمان اس سے استفادہ کر سکیں۔